www.cpsglobal.org

January 2016 • No. 470 • Rs. 20

کسی ملک کی ترقی کا راز اس کی انسانی طاقت میں ہے۔

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 011-45760444
Mob. +91-8588822672, +91-8588822674
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy ₹ 20
One year ₹ 200
Two years ₹ 400
Three years ₹ 600
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051
(Total Pages: 52)

جنوری 2016

فہرست

رول دریافت کیجیے

قرآن کی ہر آیت میں انسان کے لیے ایک رہنمائی ہوتی ہے۔ لیکن اس رہنمائی کو جاننے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ آدمی قرآن کی آیتوں میں تدبر کرے۔ مثلاً قرآن کی ایک رہنما آیت یہ ہے: **وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ** (7:175) یعنی اور ان کو اس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں تو وہ ان سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔

قرآن کی اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ خالق نے ہر انسان کو ایک مخصوص کردار (role) کے لیے پیدا کیا ہے۔ انسان اگر اپنے آپ پر غور کرکے اس فطری رول کو دریافت کرے تو اللہ کی نصرت اس کو ملتی ہے۔ فرشتے اس کے اوپر اترنے لگتے ہیں (41:30)، اس پر تمام راہیں کشادہ ہونے لگتی ہیں، وہ ادھر ادھر بھٹکے بغیر صحیح سمت میں سفر کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے فطری رول کو انجام دینے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

اس کے برعکس معاملہ اس شخص کا ہوتا ہے جو اپنے فطری رول کو دریافت کرنے میں ناکام رہے۔ ایسے شخص کا ساتھی شیطان بن جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس کو ایک بھٹکا ہوا انسان بنا دیتا ہے۔ قرآن کی اس آیت میں بھٹکنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی فطرت کے نقشے کے مطابق صحیح سمت میں سفر نہ کرے، بلکہ بھٹک کر غلط راہوں میں چلا جائے۔ ایسا انسان اس دنیا میں بظاہر کامیاب دکھائی دے سکتا ہے، لیکن فطرت کے نقشے کے مطابق، وہ بلاشبہ ایک ناکام انسان ہوگا۔ آخرت کی دنیا میں وہ اس حال میں پہنچے گا کہ وہ وہاں صرف ایک محروم انسان ہوگا۔

یہی وہ انسان ہے جس کا حال قرآن میں اس طرح بتایا گیا ہے: **وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّى إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِنْدَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ** (24:39)

قرآن فہمی

قرآن کو سمجھنے کے لیے مفسرین نے مختلف علوم کا ذکر کیا ہے، یہ درست ہے۔ لیکن قرآن کو سمجھنے کا ایک اور ذریعہ ہے، جو بلا شبہ سب سے زیادہ اہم ہے، اور وہ تقویٰ ہے۔ یہ بات قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتی ہے: وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ (2:282) یعنی اور اللہ سے ڈرو، اللہ تم کو علم دیتا ہے۔ تقویٰ آدمی کو اللہ سے قریب کرتا ہے۔

تقویٰ آدمی کے اندر یہ مزاج بناتا ہے کہ وہ ہر چیز کے لیے اللہ سے مدد کا طالب بنے۔ اللہ سے مدد کا طالب ہونا، بیک وقت دعا بھی ہے اور عبادت بھی۔ ایسی دعا سے قرآن فہمی میں بھی مدد ملتی ہے، اور اس کے ذریعے عبادت کا ثواب بھی حاصل ہوتا ہے۔

قرآن فہمی کے لیے اللہ سے مدد کی دعا کرنا، بے حد اہم ہے۔ یہ گویا کتاب کو سمجھنے کے لیے خود کتاب کے مصنف سے کنسلٹ (consult) کرنا ہے۔ یہ صرف قرآن کی صفت ہے کہ اس کا مصنف ہر لمحہ اور ہر مقام پر کنسلٹ کرنے کے لیے موجود ہے۔ اللہ کی طرف سے ہدایت بلا شبہ ہر انسان کے لیے آتی ہے لیکن یہ ہدایت لفظوں کی صورت میں نہیں آتی، بلکہ وہ انسپریشن (inspiration) کی صورت میں آتی ہے۔

قرآن سے ثابت ہے کہ اللہ آسمانوں کو الہام (41:12) کرتا ہے، اللہ شہد کی مکھیوں کو الہام (16:68) کرتا ہے، اللہ عام انسانوں کو بھی الہام (8:91) کرتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ اللہ اس انسان کی مدد کرے جو اس سے قرآن فہمی کے لیے دعا مانگ رہا ہے۔

امام ابن تیمیہ کے بارے میں آتا ہے کہ جب قرآن کی کوئی آیت ان کو مشکل نظر آتی تو وہ اللہ سے یہ دعا کرتے: **یا معلم ابراهیم علمنی** (**إعلام الموقعين عن رب العالمين، لابن قيم**، جلد 4، صفحہ 198) یعنی اے ابراہیم کو تعلیم دینے والے میری تعلیم فرما۔ قرآن میں ابراہیم کو تعلیم دینے کا ذکر معنیً سورہ الانبیاء آیت نمبر 51 میں آیا ہے۔

دینِ مبین

ایک طویل حدیثِ رسول میں دین اسلام کے بارے میں یہ الفاظ آئے ہیں: **قد ترکتکم علی البیضاء لیلها کنهارها** (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 43، مسند احمد، حدیث نمبر 17142) یعنی میں نے تم کو ایک روشن دین پر چھوڑا ہے، اس کی رات بھی اس کے دن کی طرح ہے۔ پھر اسی روایت میں آگے یہ الفاظ ہیں: **ومن یعش منکم فسیری اختلافا کثیرا**۔ یعنی تم میں سے جو زندہ رہے گا، وہ امت میں بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا۔

یہاں یہ سوال ہے کہ جب دین صبح کی طرح روشن ہے تو اس میں اختلافات کیسے پیدا ہوجائیں گے۔ اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ دین کے دو پہلو ہیں۔ ایک، اصل دین اور دوسرے، تفصیلاتِ دین۔ دونوں اگرچہ دین کا حصہ ہیں۔ لیکن دونوں کے درمیان نوعیت کے اعتبار سے فرق ہے۔ اصل دین میں توحد مطلوب ہے اور تفصیلاتِ دین میں تعدد۔ اس حقیقت کو ملحوظ رکھا جائے تو اختلاف کی برائی پیدا نہ ہوگی۔ جب اس حقیقت کو بھلا دیا جائے تو اس کے بعد امت اختلافِ کثیر میں مبتلا ہوجائے گی۔

امورِ اتفاقی میں توحد (یکسانیت) مطلوب ہے اور امورِ اختلافی میں تعدد اور توسع۔ مگر فقہاء اس راز کو سمجھ نہ سکے، انھوں نے خود ساختہ طور پر اصولِ ترجیح وضع کیا اور اس کے تحت امورِ اختلافی میں بھی توحد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ چوں کہ امورِ اختلافی میں توحد ممکن نہ تھا۔ اس لیے عملاً یہ ہوا کہ امت واحدہ امت متفرقہ میں تبدیل ہوگئی۔

مثلاً فرض نمازوں میں رکعات کی تعداد کا تعلق اتفاقی حصہ سے ہے اور ہاتھ کیسے باندھا جائے اس کا تعلق اختلافی حصہ سے۔ مگر اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ امت میں مسلکی اختلاف واقع ہوا۔ اور اس اختلاف کی بنا پر امت میں غیر ضروری طور پر کئی فرقے بن گیے۔ اس اختلاف نے بڑھتے بڑھتے شدت کی صورت اختیار کرلی۔

امت کا مشن

قرآن مستند کتابِ ہدایت ہے۔ تبلیغِ قرآن پیغمبر کا مشن بھی ہے اور امت کا مشن بھی۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک متعلق آیت کا مطالعہ کیجیے: وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَذَا الْقُرْآنُ لِأُنْذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ۔ (6:19) یعنی میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ سے تم کو آگاہ کروں اور وہ بھی جن کو یہ پہنچے۔ وَمَنْ بَلَغَ کی تفسیر میں مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنے تدبر قرآن میں درست طور پر لکھا ہے: یہ ضمیر متکلم پر معطوف ہے یعنی میں اس کے ذریعے سے تم کو خبردار کروں اور جن کو یہ (قرآن) پہنچے وہ بھی اپنی اپنی جگہ پر اس کے ذریعے سے لوگوں کو خبردار کریں۔

قرآن کی اس آیت کے مطابق، امت اپنی دعوتی ذمہ داری کے اعتبار سے نبی کی قائم مقام ہے۔ اللہ نے اپنی آخری کتاب، قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا۔ اس کے بعد ایسے اسباب فراہم کیے کہ قرآن پوری طرح ایک محفوظ کتاب بن گیا۔ اس بنا پر اب دنیا میں کوئی پیغمبر آنے والا نہیں۔ پیغمبر کا دعوتی کام پیغمبر کے بعد اب پیغمبر کی امت کو انجام دینا ہے۔ امت پر فرض ہے کہ وہ قیامت تک تبلیغِ قرآن کے اس مشن کو ہر زمانے کے لوگوں کے درمیان جاری رکھے۔ پیغمبر نے اپنے زمانے کے لوگوں تک براہ راست قرآن کو پہنچایا۔ پیغمبر کے بعد امت کو ہر زمانے میں اپنے معاصر لوگوں تک قرآن پہنچاتے رہنا ہے:

> This Quran has been revealed to me so that through it I may warn you, and the Ummah may warn others through this Quran.

قرآن کی تبلیغ ہی دینِ اسلام کا اصل نشانہ ہے۔ پرنٹنگ پریس کے دور سے پہلے، اصحابِ رسول قرآن کو پڑھ کر سناتے تھے، اس لیے ان کو مقری کہا جاتا تھا۔ اب پرنٹنگ پریس کا زمانہ ہے۔ امت کا فرض ہے کہ وہ قرآن کا ترجمہ ہر زبان میں مطبوعہ صورت میں تیار کرے، اور اس کو ہر قوم کے لوگوں کے درمیان پہنچائے۔ گویا کہ پیغمبر کا ہر صحابی قرآن کا مقری تھا، اب امت کے ہر فرد کو قرآن کا ڈسٹری بیوٹر بننا ہے۔

انسان کا المیہ

قرآن (17:70) کے مطابق انسان ایک مکرم مخلوق (honourable creature) کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے۔ فطرت کے اعتبار سے انسان کے اندر غیر معمولی امکانات (potential) موجود ہیں۔ مگر بہت کم ایسے انسان ملیں گے جنھوں نے اپنے فطری امکان (potential) کو واقعہ (actual) بنایا ہو۔ بیشتر انسان عملاً کمتر استعمال کا کیس (case of under-utilization) بن کر رہ گیے۔ اس حقیقت کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ (7:176)۔ یعنی قانونِ فطرت کے مطابق، اس کو موقع تھا کہ وہ اپنے آپ کو انسانیت کے اعلی مقام پر پہنچائے، مگر وہ عملاً حیوان جیسی کمتر زندگی پر قانع ہو کر رہ گیا۔

یہ تاریخ کا ایک حادثہ ہے۔ اور اس حادثہ کو بلا شبہ تاریخ کا سب سے بڑا المیہ (greatest tragedy) کہا جاسکتا ہے۔ تاریخ کے ریکارڈ کے مطابق، محفوظ طور پر کہا جاسکتا ہے کہ بیشتر انسان نے دو میں سے ایک غلطی کا ارتکاب کیا۔ یا وہ اپنے کمتر استعمال کا کیس بن گیا اور کسی نے یہ شدید تر غلطی کی کہ اس نے اپنی صلاحیت کا غلط استعمال کیا۔ اپنی اعلی صلاحیت کو انسانیت کی تعمیر کے بجائے انسانیت کی تخریب میں لگا دیا۔

دنیا کے فنکار (artist) اپنی تخلیقی صلاحیت کے کمتر استعمال کی مثال ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت کا ایک ایسا استعمال کیا جس کو فطرت کے نقشہ کے مطابق، اعلی استعمال کے بجائے ادنیٰ استعمال کہا جاسکتا ہے۔ اپنی صلاحیتوں کا غلط استعمال کی مثال دنیا کے تمام ڈکٹیٹر ہیں۔ ان کو فطرت نے غیر معمولی صلاحیت دی تھی۔ لیکن وہ فطرت کی آواز کو سن نہ سکے۔ انھوں نے صرف اپنی اَنا (ego) کو جانا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صرف تخریب کاری کی مثال قائم کر کے دنیا سے چلے گیے۔ کامیاب انسان وہ ہے جو خالق کے تخلیقی نقشہ کے مطابق اپنے آپ کو استعمال کرے۔

امانت کیا ہے

انسان کے مقصد تخلیق کے بارے میں قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (33:72) یعنی ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کیا اور وہ اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔ بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔

امانت سے مراد یہاں اختیار کی آزادی (freedom of choice) ہے۔ کائنات میں یہ آزادی صرف انسان کو حاصل ہے، انسان کے سوا کسی اور مخلوق کو یہ آزادی حاصل نہیں۔ ظلوم اور جہول کا لفظ اس آیت میں باعتبارِ نتیجہ ہے۔ یعنی انسان نے ایڈونچرزم (adventurism) کے تحت اس امانت کو قبول کرلیا، لیکن عملاً وہ اس پر پورا نہیں اترے۔ اس بنا پر وہ باعتبار نتیجہ ظالم اور جاہل قرار پائے۔

انسان کو نفسیات کی زبان میں سوچنے والا حیوان (thinking animal) کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سوچ ہی وہ چیز ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے یا غیر انسان۔ سوچ کا صحیح استعمال انسان کو کامیابی کی طرف لے جاتا ہے، اور سوچ کا غلط استعمال انسان کو ہر اعتبار سے ناکام بنا دیتا ہے۔

انسان کو سوچنے کی صلاحیت اس لیے دی گئی ہے کہ وہ اس کا صحیح استعمال کرے، وہ تخلیق میں تدبر کرے، وہ تخلیق کی معنویت کو تلاش کرے، وہ تخلیق کی حکمت کو دریافت کرے، وہ تخلیق کے مقصد کو پائے اور اس کے مطابق اپنی زندگی کی تشکیل کرے۔ یہی تدبر امانت کے صحیح استعمال کا آغاز ہے۔ اسی تدبر میں کامیابی کا نام کامیابی ہے، اور اسی تدبر میں ناکامی کا نام ناکامی۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اس معاملے میں آخری حد تک فرض شناسی کا ثبوت دے۔

تالیفِ قلب

تالیف قلب کا مطلب ہے دل میں نرم گوشہ (soft corner) پیدا کرنا۔ ایسے لوگوں کے لیے قرآن میں مؤلفۃ القلوب (9:60) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ تالیف قلب کا تعلق دعوتی اخلاقیات سے ہے۔ مدعو کے ساتھ اس نوعیت کا حسنِ سلوک (friendly behaviour) جس سے مدعو کے دل میں اسلام سے قربت پیدا ہو، وہ معتدل ذہن کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کرے، وہ کسی تعصب کے بغیر کھلے ذہن کے ساتھ اسلام کو سمجھے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو تجارتی تعلقات کے دائرے میں کسٹمر فرینڈلی بیہیویر (customer-friendly behaviour) کہا جاتا ہے۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تالیف قلب کی ایک مثال وہ ہے جب کہ ہجرت کے بعد آپ نے اپنی نماز کے لیے کعبہ کے بجائے یہود کے قبلہ کو اپنا قبلہ بنالیا۔ مفسر النسفی نے اپنی تفسیر مدارک التنزیل وحقائق التاویل میں تالیف قلب کی پیغمبرانہ مثال دیتے ہوئے لکھا ہے:

روی أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلي بمكة إلى الكعبة ثم أمر بالصلاة إلى صخرة بيت المقدس بعد الهجرة تألیفاً للیهود ثم حول إلى الكعبة (تفسیر النسفی، بیروت، 1998، جلد 1، البقرۃ آیت 143)۔ یعنی روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں کعبہ کا طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، پھر ہجرت کے بعد آپ کو حکم ہوا کہ آپ اپنی نماز قبلۂ یہود صخرۃ کی طرف رخ کر کے ادا کریں، ایسا یہود کی تالیف قلب کے لیے کیا گیا، پھر بعد کو آپ کا قبلہ کعبہ کی طرف کر دیا گیا۔

تالیف قلب اسلام کی ایک جامع تعلیم ہے۔ اس کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔ مومن کے لیے ہر انسان مدعو ہے۔ اس لیے مومن کو ہر انسان کے ساتھ تالیف قلب کے اصول پر معاملہ کرنا ہے۔ تالیف قلب کا اصول کوئی وقتی یا محدود اصول نہیں ہے، وہ ہمیشہ کے لیے اہل ایمان سے مطلوب ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر ابتدائی زمانے میں سورہ المدثر اتری۔ اس سورہ میں دعوت کا

حکم دیتے ہوئے ایک اصول یہ دیا گیا کہ وَلَا تَمۡنُن تَسۡتَكۡثِرُ (74:6) یعنی اور ایسا نہ کرو کہ احسان کرو اور بہت بدلہ چاہو۔ اس حکم کا تعلق دعوت کے عمل سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت کا کام اس طرح کرنا چاہیے کہ داعی کو یہ امید نہیں رکھنا چاہیے کہ مدعو کی طرف سے اس کو اچھا جواب ملے گا:

Do good without expecting anything in return

یہود کی تالیف کے لیے یہود کے قبلۂ عبادت کو اپنا قبلہ بنانا، بتاتا ہے کہ تالیف قلب کی کوئی حد نہیں۔ اس کے لیے مومن کو ہر تدبیر اختیار کرنا جائز ہے۔ شرط اگر ہے تو صرف یہ کہ مومن کی نیت کسی ذاتی مفاد کو حاصل کرنا نہ ہو بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہو کہ مدعو کے دل میں اسلام کے لیے نرم گوشہ (soft corner) پیدا ہو، اور وہ کھلے ذہن کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کرے۔

پیغمبر اسلام کی سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ہر ممکن طریقے سے مدعو کی تالیف قلب کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً مکی دور میں کعبہ کے اندر بتوں کی موجودگی کو نظر انداز کرکے لوگوں کو اسلام کا پیغام پہنچانا، کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنا بغیر احتجاج کیے ہوئے جب کہ کعبہ کے اندر 360 بت رکھے ہوئے تھے، غزوہ حنین میں آپ کو بڑی تعداد میں مالِ غنیمت حاصل ہوا تھا، آپ نے اس کی بڑی مقدار ان لوگوں کو دے دی جنھوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ایسا آپ نے ان لوگوں کی تالیف قلب کے لیے کیا تھا۔

تالیف قلب کا ایک واقعہ وہ ہے جو حدیبیہ معاہدہ کی بات چیت کے دوران پیش آیا۔ حدیبیہ معاہدہ کی بات چیت تقریباً دو ہفتہ تک جاری رہی تھی۔ اس مدت میں تالیف کے مختلف واقعات پیش آئے۔ ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ آپ کو یہ معلوم ہوا کہ قبیلہ بنی کنانہ کا سردار الحلیس بن علقمہ قریش کی طرف سے آپ سے بات چیت کے لیے آرہا ہے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے کہا کہ یہ قبیلہ قربانی کے اونٹوں کی تعظیم کرتا ہے، وہ اس کو والہ کا درجہ دیتا ہے۔ اس لیے تم اس کے استقبال کے لیے اونٹ لے کر نکلو۔ چناں چہ صحابہ نے ایسے ہی کیا۔ وہ آدمی بہت خوش ہوا۔ اور واپس جا کر قریش کو بہت مثبت رپورٹ دی۔ یہ واقعہ صحیح البخاری حدیث نمبر 2731، اور مسند احمد،

حدیث نمبر 18928 میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ سیرۃ ابن ہشام، مغازی الواقدی، سیرۃ ابن کثیر، الروض الانف وغیرہ کتب سیرت میں آیا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان تالیف قلب کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں، بشرطیکہ ان کا یہ فعل خالصتہً دعوت الی اللہ کے لیے ہو۔ اس حدیث کو اگر لفظاً لیا جائے تو شاید یہ کہنا درست ہوگا کہ اگر کوئی مسلم لیڈر ہندستانیوں سے گفت وشنید کررہا ہو، اور اس درمیان اس کو بتایا جائے کہ ایک ہندولیڈر اس سے ملنے کے لیے آرہا ہے۔ تو اس موقع پر مسلم لیڈر کے لیے یہ کرنا جائز ہوگا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو کہے کہ اس ہندولیڈر کے یہاں گائے کی پوجا کی جاتی ہے، اس لیے تم اس کا اس طرح استقبال کرو کہ اس کے پاس گائے لے کر جاؤ۔ تو ایسا کرنا اس کے لیے جائز ہوگا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ وہ ہے جو نجران کے عیسائیوں کے ساتھ پیش آیا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے مدینہ آئے۔ یہاں انھوں نے مدینہ کی مسجدِ نبوی کے اندر اپنے طریقے کے مطابق عبادت کی۔ روایت کے مطابق انھوں نے اپنی یہ عبادت مشرق کی طرف رخ کرکے کی (**فصلوا إلى المشرق**) سیرۃ ابن ہشام (1/574)، جب کہ مدینہ سے کعبہ کا رخ اس سے مختلف تھا۔

ملّی تعمیر کا کام سب سے پہلے ملّت کے افراد میں شعور پیدا کرنے کا کام ہے۔ اِس کی بہترین صورت یہ ہے کہ الرسالہ مشن کو ایک ایک بستی اور ایک ایک گھر میں پہنچایا جائے۔

شباب کا زمانہ

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن ہر انسان سے کچھ باتوں کے بارے میں ضرور سوال کیا جائے گا۔ اس روایت کا ایک حصہ یہ ہے: **وعن شبابه فيم أبلاه**- (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2416) یعنی یہ پوچھا جائے گا کہ اپنی جوانی کا دور اس نے کیسے گزارا۔ جوانی کا دور کسی انسان کے لیے اس کی عمر کا سب سے اچھا دور ہے۔ اس لیے جوانی کے دور کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ سوال ہوگا۔

جوانی کا دور (youth age) کیا ہے۔ وہ صحت کے دور (age of good health) کا دوسرا نام ہے۔ صحت ہے تو سب کچھ ہے اور صحت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ جو آدمی تندرستی سے محروم ہو جائے، وہ گویا ہر چیز سے محروم ہو گیا۔ صحت کا دور کسی انسان کے لیے سب بڑے شکر کا آئٹم ہے۔

ایک ایسی دنیا کا تصور کیجیے جہاں ہر عورت اور ہر مرد جوانی اور صحت سے محروم ہو۔ ایسی دنیا گویا ایک بہت بڑا اسپتال ہوگی۔ ایک ایسا اسپتال جہاں کوئی ڈاکٹر یا کوئی نرس موجود نہ ہو۔ جہاں علاج کی سہولتیں (health facilities) نہ پائی جاتی ہوں۔ جہاں ہر ایک علاج کا ضرورت مند ہو لیکن وہاں کوئی معالج موجود نہ ہو۔ ایسی دنیا ایک ناقابل برداشت مصیبت کی جگہ بن جائے گی۔

جوانی کے دور میں ہر انسان کو بھرپور طاقت حاصل رہتی ہے۔ اس لیے جوانی کے دور میں آدمی کو مسائل کا تجربہ نہیں ہوتا۔ جوانی کا دور گویا بے مسئلہ دور ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے اس قیمتی دور پر آدمی نے خالق کے اس عطیہ کا شکر ادا کیا یا نہیں۔ جوانی سے اس نے تکبر (arrogance) کی غذا لی یا تواضع (modesty) کی غذا۔ وہ دوسروں کے لیے بے مسئلہ بن کر رہا یا بامسئلہ بن کر رہا۔ اس کے ذریعے دنیا کو خیر ملا یا لوگوں کو اس سے شر کا تجربہ ہوا۔ جوانی کی عمر انسان کے لیے اس کی زندگی کا بہترین دور ہے۔ جوانی کی عمر میں آدمی کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے۔ جوانی کا دور عظیم شکر کا دور بھی بن سکتا ہے اور عظیم ناشکری کا دور بھی۔

بڑا اجر

ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے :**إن عظم الجزاء مع عظم البلاء، وإن الله إذا أحب قوما ابتلاهم، فمن رضي فله الرضا، ومن سخط فله السخط** (سنن الترمذی، حدیث نمبر: 2396) یعنی بے شک بڑا اجر بڑی آزمائش کے ساتھ ہے، اور اللہ جن لوگوں سے محبت کرتا ہے، ان کو وہ آزمائش میں ڈال دیتا ہے، تو جو راضی ہو گیا، اس کے لیے رضامندی ہے، اور جو ناراض ہو گیا، اس کے لیے ناراضگی ہے۔ اس حدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آزمائش ایمانی ترقی کا زینہ ہے۔ آزمائش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے ذہن میں ایک ہل چل پیدا ہوتی، اس کی چھپی ہوئی صلاحیتیں جاگتی ہیں، اس کو طرح طرح کے شاک (shock) کا تجربہ ہوتا ہے۔

ان ناخوشگوار تجربات کے دوران جو آدمی منفی نفسیات میں مبتلا ہو جائے، جو نفرت اور غصہ کا شکار ہو جائے، جو شکایت اور جھنجلاہٹ میں جینے لگے، وہ آزمائش میں ناکام ہو گیا۔ ایسے انسان کو آزمائش سے کچھ نہیں ملے گا۔ اس کے برعکس، جو انسان ذہنی بیداری کے ساتھ جیتا ہو، وہ آزمائش میں اعتدال پر قائم رہے گا، ناخوشگوار تجربہ کے باوجود وہ اپنی مثبت سوچ (positive thinking) کو باقی رکھے گا۔ یہی وہ انسان ہے جس نے آزمائش سے خیر کی غذا حاصل کی۔

آزمائش بظاہر کسی نہ کسی مصیبت کی شکل میں آتی ہے۔ جو لوگ مصیبت سے گھبرا اٹھیں، ان کو آزمائش سے شکایت اور مایوسی کے سوا کچھ اور نہیں ملے گا، لیکن جو لوگ آزمائش کو اللہ کے منصوبے کا جزء سمجھیں، وہ آزمائش کا استقبال مثبت ذہن کے ساتھ کریں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آزمائش، ان کے اجر میں اضافے کا سبب بن جاتی ہے۔

اللہ کے یہاں انعامات کی کمی نہیں۔ لیکن کسی کو اللہ کا بڑا انعام ہمیشہ اس وقت ملتا ہے، جب کہ وہ اس کے لیے بڑا استحقاق پیدا کرے۔ بڑے استحقاق کا خلاصہ صرف ایک ہے، اور وہ یہ ہے کہ آدمی ہر حال میں اپنے آپ کو مثبت سوچ پر قائم رکھے۔ کوئی بھی واقعہ اس کی مثبت سوچ کو برہم کرنے والا نہ بنے۔

شیطان اور فرشتہ کے درمیان

قرآن کے مطابق، ہر انسان ہر وقت دو طاقتوں کے درمیان ہوتا ہے — فرشتہ اور شیطان۔ ہر موقعے پر فرشتہ اور شیطان دونوں متحرک ہوجاتے ہیں۔ فرشتہ کے لیے انسان کے اندر داخلے کا راستہ (entry point) اس کا ضمیر (conscience) ہے۔ شیطان کے لیے انسان کے اندر داخلے کا دروازہ اس کا ایگو (ego) ہے۔ فرشتہ ہر موقع پر آدمی کو صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے برعکس، شیطان ہر موقعے پر انسان کو غلط راستہ دکھاتا ہے۔ انسان جس کی رہنمائی سے متاثر ہوجائے، اسی کی طرف وہ چل پڑے گا۔

اس معاملے کی ایک تاریخی مثال وہ ہے، جس کا تعلق خلیفۂ ثانی عمر بن خطاب سے ہے۔ ان کے زمانے میں مدینہ میں ایک نصرانی ابو لؤلؤ فیروز رہتا تھا۔ اس نے خلیفہ ثانی سے شکایت کی کہ میرا خراج زیادہ ہے۔ خلیفہ ثانی نے اس سے خراج کی مقدار پوچھی۔ ابو لؤلؤ فیروز نے بتایا۔ پھر خلیفہ ثانی نے اس سے آمدنی پوچھی، تو اس نے بتایا۔ تو خلیفہ ثانی نے کہا کہ آمدنی کے لحاظ سے تمھارا خراج زیادہ نہیں ہے۔ ابولولو اس پر غصہ ہوگیا۔ وہ ایک دن فجر کے وقت مدینہ کی مسجد میں داخل ہوا، اور خنجر مار کر خلیفہ ثانی کو قتل کردیا۔ (ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، طبعۃ بیروت 1979 :3 /49—50)

خلیفہ ثانی عمر بن خطاب بلاشبہ ایک عادل حکمراں تھے۔ انھوں نے ایشیا اور افریقہ کے بڑے رقبے میں امن اور قسط کا نظام قائم کیا تھا۔ لیکن ابولؤلؤ فیروز نے اتنے بڑے واقعے کو نہیں دیکھا۔ وہ ایک چھوٹے سے واقعہ پر غصہ ہوگیا، یہاں تک کہ اس نے خلیفہ کو قتل کردیا۔ اس وقت اس پر شیطان کا غلبہ ہوگیا تھا۔ بڑا واقعہ اس کو چھوٹا نظر آیا، اور چھوٹا واقعہ اس کو بڑا دکھائی دیا۔ حتی کہ ایک عادل حکمراں اس کی نظر میں ایک ظالم حکمراں بن گیا۔ اس واقعے میں ہر عورت اور ہر مرد کے لیے سبق ہے۔ جب بھی کوئی شخص غصہ ہو تو اس کو اس سے بچنا چاہیے کہ وہ معاملے کے بڑے پہلو کو چھوٹا سمجھے، اور معاملے کے چھوٹے پہلو کو بڑا سمجھنے لگے۔ اگر ایسا ہو تو اس کو سمجھنا چاہیے کہ وہ شیطان کے قبضے میں آ گیا ہے۔

زندہ قوم، زوال یافتہ قوم

زندہ قوم وہ ہے جس کے اندر فطری اوصاف پائے جائیں۔ اور زوال یافتہ قوم وہ ہے جس کے افراد کے اندر دھیرے دھیرے فطری اوصاف ختم ہوجائیں۔ فطری اوصاف سے مراد ہے سچائی، دیانت داری، اصول پسندی، واقعہ کا اعتراف، اور کھلاپن (openness)، وغیرہ۔ اس کے برعکس، جب قوم پر زوال آتا ہے تو اس کے اندر جھوٹ بولنا عام ہوجاتا ہے، اس کے افراد اصول پسند کے بجائے مفاد پرست بن جاتے ہیں۔ زوال یافتہ قوم کے افراد حساسیت سے محروم ہوجاتے ہیں، اور جو لوگ حساسیت سے محروم ہوجائیں، ان کے اندر حق و باطل کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ ایسے افراد تنگ نظری میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

زندہ فرد قابلِ پیشین گوئی کیرکٹر (predictable character) کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، زوال یافتہ قوم کے افراد اس قسم کے کردار سے خالی ہوجاتے ہیں۔ زندہ انسان ہرے بھرے درخت کی مانند ہے، اور غیر زندہ انسان سوکھے درخت کی مانند۔ زندہ درخت ہمیشہ گرو (grow) کرتا رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کو پھول اور پھل اور سایہ جیسی چیزیں دیتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس، سوکھا درخت ان میں سے کوئی چیز دوسروں کو نہیں دیتا۔ وہ ایک ایسا درخت ہے جو دینے کی صلاحیت سے محروم ہوجائے۔ یہی حال زندہ انسان اور غیر زندہ انسان کا ہے۔

زندہ انسان دوسرے انسانوں کے لیے ایک سرمایہ (asset) ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے لیے کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتا ہے۔ اس کے برعکس، غیر زندہ انسان ایک ایسا انسان ہے جو دوسرے لوگوں کے لیے ایک بوجھ (liability) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے دوسرے انسانوں کو کچھ نہیں ملتا۔ وہ اپنے گھر والوں کے لیے مسئلہ ہے، اور اپنے سماج کے لیے مسئلہ ہے۔ زندہ انسان اپنے سماج کے لیے دینے والا ممبر (giver member) ہوتا ہے۔ اور غیر زندہ انسان وہ ہے جو اپنے سماج کے لیے صرف لینے والا ممبر (taker member) بن جائے۔

والدین کی ذمہ داری

اولاد کی تربیت کے بارے میں ایک حدیثِ رسول ان الفاظِ میں آئی ہے: **ما نحل والد ولداً من نَحل أفضل من أدب حسن**۔(سنن الترمذی، حدیث نمبر1952) کسی باپ کی طرف سے اس کے بیٹے کے لیے سب سے بہتر تحفہ یہ ہے کہ وہ اس کی اچھی تربیت کرے۔

اس حدیث میں ادب حسن کا مطلب زندگی کا بہتر طریقہ ہے۔ بیٹا یا بیٹی بڑے ہونے کے بعد دنیا میں کس طرح رہیں کہ وہ کامیاب ہوں، وہ اپنے گھر اور اپنے سماج کا بوجھ (liability) نہ بنیں بلکہ اپنے گھر اور اپنے سماج کا سرمایہ (asset) بن جائیں۔

والدین اپنے بچوں کو اگر لاڈ پیار (pampering) کریں تو انھوں نے بچوں کو سب بُرا تحفہ دیا۔ اور اگر والدین اپنے بچوں کو زندگی گزارنے کا کامیاب طریقہ بتائیں، اور اس کے لیے ان کو تیار کریں تو انھوں نے اپنے بچوں کو بہترین تحفہ دیا۔ مثلاً بچوں میں یہ مزاج بنانا کہ وہ دوسروں کی شکایت کرنے سے بچیں۔ وہ ہر معاملے میں اپنی غلطی تلاش کریں، وہ اپنی غلطی تلاش کرکے اس کو درست کریں، اور اس طرح اپنے آپ کو بہتر انسان بنائیں۔ وہ دنیا میں تواضع (modesty) کے مزاج کے ساتھ رہیں، نہ کہ فخر اور برتری کے مزاج کے ساتھ۔ زندگی میں ان کا اصول حیات یہ ہو کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہرائیں، نہ کہ دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانے کی کوشش کریں۔ وہ اپنے وقت اور اپنی توانائی کو صرف مفید کاموں میں لگائیں۔

والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو یہ بتائیں کہ اگر تم غلطی کرو تو اس کی قیمت تم کو خود ادا کرنا ہوگا۔ کوئی دوسرا شخص نہیں جو تمھاری غلطی کی قیمت ادا کرے۔ کبھی دوسروں کی شکایت نہ کرو۔ دوسروں کی شکایت کرنا اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے۔ ہمیشہ مثبت انداز سے سوچو، منفی سوچ سے مکمل طور پر اپنے آپ کو بچاؤ۔ بری عادتوں سے اس طرح ڈرو، جس طرح کوئی شخص سانپ بچھو سے ڈرتا ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ اپنی اولاد کو ڈیوٹی کانشش بنائیں، نہ کہ رائٹ (right) کانشش۔

رب العالمین کا عطیہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنا مشن شروع کیا۔ اس کے بعد وہ وقت آیا، جب کہ مکہ کے سرداروں نے آپ کو مجبور کیا کہ آپ مکہ چھوڑ کر یہاں سے چلے جائیں۔ اس وقت پیغمبر اسلام نے اپنے اصحابِ سے فرمایا: أمرت بقرية تأكل القرى، يقولون يثرب، وهي المدينة (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1871) یعنی مجھے ایک بستی کا حکم دیا گیا ہے جو بستیوں کو کھا جائے گی، لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں، اور وہ مدینہ ہے۔

اس روایت میں جو بات کہی گئی ہے اس کا تعلق فضیلتِ رسول یا فضیلتِ مدینہ سے نہیں ہے بلکہ اس میں ایک عام سنت الٰہی کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ جب کسی انسان کے ساتھ یک طرفہ طور پر ظلم کا معاملہ کیا جائے، یا اس سے کوئی چیز ناحق چھین لی جائے تو ایسا شخص اللہ کی نصرتِ خاص کا مستحق ہوجاتا ہے۔ اللہ ایسے بندے کو اپنی طرف سے اس سے بہت زیادہ دے دیتا ہے جو انسانوں نے اس سے ناحق طور پر چھینا تھا۔

اللہ کا یہ خصوصی عطیہ اس انسان کو ملتا ہے جو اس عطیے کا استحقاق پیدا کرے۔ وہ استحقاق یہ ہے کہ ایسے موقعے پر وہ آخری حد تک بے شکایت انسان بنا رہے۔ اس کی نظر کسی حال میں اللہ رب العالمین سے ہٹنے نہ پائے۔ وہ اپنے ظالموں کے لیے دعا کرے، اور خود اپنے لیے ہر حال میں اللہ سے امیدوار بنا رہے۔ جب کوئی انسان اس طرح مثبت رویے کا ثبوت دیتا ہے تو یہ اس کے لیے کوئی سادہ بات نہیں ہوتی۔ اس کے بعد اس کے اندر ایک نئی شخصیت ابھرتی ہے، ایک ایسی شخصیت جس کے اندر اپنے ظالموں کے لیے خیر خواہی کا جذبہ ہو، جو منفی تجربہ کے دوران بھی مثبت رویے پر قائم رہے، جو اپنے معاملے کو مکمل طور پر اللہ کے حوالے کردے۔ جس کا سینہ ہر حال میں ربانی اسپرٹ سے بھرا رہے۔ جو اپنی طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہ کرے، بلکہ اپنے تمام معاملے کو اللہ رب العالمین کے حوالے کردے۔ یہی وہ انسان ہے جس کو اللہ کی طرف سے وہ خصوصی عطیہ دیا جاتا ہے جس کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے۔

اتھاریٹی صرف ایک

حدیث کی کتابوں میں ایک لمبی روایت آئی ہے، جس کا ایک حصہ یہ ہے: **لو كان موسى حيا ما وسعه إلا اتباعي** ۔(شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر 174) یعنی اگر موسی زندہ ہوتے تو ان کے لیے اس کے سوا کچھ اور جائز نہ ہوتا کہ وہ میری اتباع کریں۔ اس حدیث کو علماء نے عام طور پر فضیلتِ رسول کے معنی میں لیا ہے، مگر یہ درست نہیں۔ فضیلتِ انبیاء کا تصور قرآن و حدیث سے ٹکراتا ہے۔ قرآن میں آیا ہے کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ (2:285) یعنی ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے: **لا تفضلوا بين أنبياء الله** (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3414) یعنی اللہ کے پیغمبروں کے درمیان ایک کو دوسرے پر فضیلت نہ دو۔

اصل یہ ہے کہ اوپر مذکور حدیث میں شخصی فضیلت کا ذکر نہیں ہے۔ اس میں ایک عام اصول بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اتھاریٹی ہمیشہ ناقابلِ تقسیم ہوتی ہے۔ نظم کا تقاضا ہے کہ اتھاریٹی صرف ایک ہو۔ جہاں بھی اتھاریٹی دو یا دو سے زیادہ ہوگی، نظم (discipline) قائم نہ رہے گا۔ حضرت موسی کے زمانے میں دو پیغمبر تھے، موسی اور ہارون۔ لیکن اتھاریٹی کی حیثیت صرف موسی کی تھی، ہارون کو نہ تھی۔ حضرت ہارون کا کام حضرت موسی کی تصدیق کرنا تھا (28:34)۔

تفضیلِ انبیاء کا عقیدہ بلاشبہ قرآن اور حدیث میں اجنبی ہے۔ انبیاء کے درمیان ایک فرق ضرور پایا جاتا ہے۔ یہ فرق رول کے اعتبار سے ہے، نہ کہ فضیلت کے اعتبار سے۔ اس پہلو سے ہر پیغمبر نمونہ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ مختلف پیغمبروں کے حالات کا مطالعہ کرے۔ جس پیغمبر میں اس کو اپنے حالات کے اعتبار سے مطابقت ملے، اس کو وہ اپنا لے۔ یہ پیروی طریقِ کار (method) کے اعتبار سے ہے۔ جہاں تک عقیدہ اور اصولِ دین کا سوال ہے، تمام پیغمبروں کا عقیدہ اور اصول دین ایک تھا۔

ذہنی سانچہ

ہر آدمی کے اندر مختلف حالات کے تحت اس کا ایک مائنڈ سیٹ (mindset) یا ایک ذہنی سانچہ (intellectual mould) بن جاتا ہے۔ آدمی اسی کے مطابق سوچتا ہے، آدمی اسی کے مطابق رائے بناتا ہے۔ حقیقتِ واقعہ خواہ بظاہر کچھ اور ہو، لیکن آدمی کے ذہن میں چیزوں کے بارے میں وہی تصویر بنتی ہے، جو اس کے اپنے ذہنی سانچے کے مطابق ہو۔

انسان کے بارے میں یہ حقیقت قرآن میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَىٰ سَبِيلًا (17:84) یعنی علم الٰہی میں کسی چیز کی نوعیت خواہ کچھ ہو لیکن انسان اپنے خود ساختہ شاکلہ (mindset) کے مطابق چیزوں کے بارے میں رائے قائم کر لیتا ہے۔ اس کمزوری سے وہی شخص بچ سکتا ہے جو اپنے ذہن کو اتنا زیادہ ارتقا یافتہ بنائے کہ وہ چیزوں کو اللہ کی نظر سے دیکھ سکے۔

انسان ایک سماجی مخلوق ہے۔ دنیا میں ہر آدمی ایک سماجی ماحول کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اس ماحول میں ہر وقت روزانہ مختلف قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ انسان خواہ چاہے یا نہ چاہے، وہ اپنے ماحول سے اثر قبول کرتا رہتا ہے۔ اس طرح ہر انسان کا کیس ایک متاثر ذہن کا کیس بن جاتا ہے۔ یہ متاثر ذہن دھیرے دھیرے اتنا پختہ ہو جاتا ہے کہ آدمی اسی کو درست سمجھنے لگتا ہے۔

ایسے حالات میں ہر عورت اور مرد کو یہ کرنا ہے کہ وہ مسلسل طور پر اپنا محاسبہ کرتا رہے۔ وہ دریافت کرتا رہے کہ کیا چیز فطری ہے۔ اور وہ کیا چیز ہے جس کو اس کے ذہن نے ماحول کے اثر سے قبول کر لیا ہے۔ اسی ذہنی کوشش کا نام محاسبہ (introspection) ہے۔ یہی محاسبہ کا عمل وہ چیز ہے جو کسی انسان کو اس سے بچاتا ہے کہ آدمی کے اندر غلط قسم کا ذہنی سانچہ بن جائے، اور وہ اس غلط سانچہ کے زیرِ اثر زندگی گزارنے لگے۔ اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ آدمی اپنا محاسب آپ بن جائے، وہ اپنی نگرانی خود کرنے لگے۔

دنیا اور آخرت

انسان موجودہ دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔ یہاں وہ اپنے صبح وشام گزارتا ہے۔ مختلف تجربات کے دوران یہاں اس کی زندگی کا سفر جاری رہتا ہے۔ ان تجربات کے درمیان شعوری یا غیر شعوری طور پر انسان کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ یہی موجودہ دنیا اس کے لیے حقیقی دنیا (real world) ہے۔ اس کے مقابلہ میں اس کو محسوس ہوتا ہے کہ آخرت کی دنیا تصوراتی دنیا (imaginary world) ہے۔ دونوں دنیاؤں کے درمیان بظاہر اس فرق کی بنا پر یہ ہوتا ہے کہ انسان کا تفکیری عمل (thinking process) موجودہ دنیا کی سطح پر جاری ہوجاتا ہے۔ اس کی سوچ اور اس کی منصوبہ بندی میں عملاً آخرت کے لیے کوئی حقیقی جگہ باقی نہیں رہتی۔ یہ انسان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ وسیع تر انجام کے اعتبار سے صحیح یہ ہے کہ انسان کے اندر آخرت رخی سوچ (Akhirat-oriented thinking) بنے نہ کہ دنیا رخی سوچ۔

انسان کو اس معاملہ میں بے راہ روی سے بچانے کے لئے فطرت نے یہ انتظام کیا ہے کہ موجودہ دنیا کو مسائل کی دنیا (دار الکبد) بنا دیا۔ یہ مسائل انسان کے لئے اسپیڈ بریکر (speed breaker) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ مسائل اس لئے ہیں کہ انسان موجودہ دنیا کو حقیقی دنیا نہ سمجھے بلکہ آخرت کے اعتبار سے اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔

زندگی کی یہی حقیقت ہے جس کو قرآن کی ایک آیت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے :

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ (2:155)۔ یعنی اور ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور ثمرہ کی کمی سے۔ اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دو۔

زندگی کے امتحان میں صبر کا رول یہ ہے کہ وہ آدمی کو ہر صورتِ حال میں ثابت قدم رکھتا ہے۔ وہ انسان کو اس سے بچاتا ہے کہ وہ درست راستے سے ہٹ کر کسی اور طرف چل پڑے۔ صبر آدمی کو ہر حال میں اصول کی روش پر قائم رکھتا ہے۔ صبر کے بغیر اس امتحان میں پورا اترنا ممکن نہیں۔

تاریخ کا سفر

قرآن کی سورہ نمبر 93 کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَكَ مِنَ الْأُولَى (الضحیٰ:4) اور یقیناً تمھارا اگلا، تمھارے لیے پچھلے سے بہتر ہے۔ قرآن کا یہ بیان کسی محدود معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ انسانی تاریخ کے بارے میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کے لیے تاریخ کا بعد کا دوران کے پچھلے دور سے بہتر ہوگا۔

قرآن ساتویں صدی عیسوی میں اترا۔ اس وقت اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ قرآن کے ذریعے تاریخ میں ایک نیا عمل (process) جاری ہوا ہے۔ یہ عمل بڑھتا رہے گا۔ یہاں تک کہ تاریخ میں ایک نیا دور آجائے، ایک ایسا دور جو اہلِ ایمان کے لیے پچھلے تمام ادوار سے بہتر حالات والا دور ہوگا۔ اکیسویں صدی اسی تبدیلی کا نقطۂ انتہا (culmination) ہے۔

قدیم دور مذہبی جبر کا دور تھا، موجودہ دور مذہبی آزادی کا دور ہے۔ قدیم دور حافظہ اور کتابت کا دور تھا، اب پرنٹنگ پریس کا دور ہے۔ قدیم دور روایتی دور تھا، موجودہ دور سائنسی دور ہے۔ قدیم دور تنگ نظری کا دور تھا، موجودہ دور کھلے پن (openness) کا دور ہے۔ قدیم دور لوکل دعوت کا دور تھا، موجودہ دور ٹکنالوجی کے ذریعے عالمی دعوت کا دور ہے، وغیرہ۔

اسی طرح قدیم دور جنگ اور تشدد کا دور تھا، موجودہ دور امن کا دور ہے۔ قدیم دور میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ کوئی چیز صرف لڑائی کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے، موجودہ دور میں یہ ممکن ہوگیا ہے کہ ایک بڑے مقصد کو مکمل طور پر امن ذریعے سے حاصل کیا جاسکے۔

اس فرق کا سب سے بڑا ظاہرہ دعوت اور تبلیغ کے میدان میں ہوا ہے۔ قدیم زمانے میں دعوت وتبلیغ کا کام پرامن طور پر کرنا ممکن نہیں تھا۔ موجودہ زمانے میں پرامن دعوت کا کام انتہائی حد تک ممکن ہوگیا ہے۔ قدیم زمانے میں دعوت کا کام صرف لوکل طور پر انجام دیا جاسکتا تھا، اب دعوت کا کام عالمی طور پر انجام دیا جاسکتا ہے، وغیرہ۔

توسط اور اعتدال

حدیث میں آیا ہے: خیر الأمور أوساطها۔(شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر :6175)
یعنی معاملات میں درمیانی طریقہ خیر کا طریقہ ہوتا ہے۔ یعنی عملی رعایت کا طریقہ۔ دین میں اعتدال کی بہت اہمیت ہے مگر اعتدال کی اہمیت باعتبار ابدی اصول نہیں ہے بلکہ اس کی اہمیت عملی حکمت (practical wisdom) کی بنا پر ہے۔ دوسرے الفاظ میں اعتدال کا مسئلہ عقیدہ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ عملی ضرورت کا مسئلہ ہے۔ اس سلسلہ میں دو باتیں بے حد اہم ہیں۔

ایک یہ کہ اعتدال کا تعلق عقائد سے نہیں ہے بلکہ معاملات سے ہے۔ اعتدال اصولی معاملات میں نہیں ہوتا بلکہ اعتدال عملی معاملات میں ہوتا ہے۔ جہاں تک اصول یا عقیدہ کا معاملہ ہے، اس میں ہمیشہ معیار (ideal) مطلوب ہوتا ہے۔ اور معیار کے معاملہ میں سچائی صرف ایک ہوتی ہے۔ اس میں کوئی متوسط راستہ یا غیر متوسط راستہ نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اعتدال کی اہمیت عملی ضرورت کی بنا پر ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان کو فکر کی آزادی حاصل ہے۔ اس بنا پر انسانوں کے درمیان عملی اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ ان اختلافات کو ختم کرنا اور سارے انسانوں کو ایک طریقہ کا پابند بنانا ممکن نہیں ہوتا۔ اس بنا پر یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اس طرح کے معاملہ میں اعتدال وتوازن (balance) کا طریقہ اختیار کرو کہ لوگوں کے درمیان ٹکراؤ نہ ہو اور زندگی کا نظام پرامن انداز میں چلتا رہے۔

اس اعتدال کا تعلق عقیدہ سے نہیں ہے بلکہ عمل سے ہے۔ عقیدہ ہمیشہ ابدی اصول پر قائم ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں توسط کا سوال نہیں۔ عمل کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ عمل کا تعلق ظاہری فارم سے ہوتا ہے۔ ظاہری فارم میں حالات کی نسبت سے ایڈجسٹمنٹ کیا جاسکتا ہے تاکہ ٹکراؤ کی صورت پیدا نہ ہو۔

امت مسلمہ کی اصلاح

امام مالک (وفات 197 ھ) دوسری صدی ہجری کے ایک عظیم مسلم اسکالر تھے۔ انھوں نے اپنے شیخ وہب ابن کیسان کے حوالے سے کہا: **إنه لا يصلح آخر هذه الأمة إلا ما أصلح أولها** (مسند الموطا للجوہری: 783) یعنی اس امت کے آخری حصہ کی اصلاح بھی اسی طریقہ پر ہوگی جس سے امت کے پہلے حصہ کی اصلاح ہوئی تھی۔

اس قول کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں ایک اور بات کو شامل کیا جائے۔ وہ یہ کہ بعد کا زمانہ، بدلا ہوا زمانہ ہوگا۔ اس لیے اس قول سے بعد کے زمانہ میں رہنمائی کے لیے ضروری ہے کہ بعد کے زمانے کے اہل علم یہ دریافت کریں کہ بعد کے زمانے کے حالات کے اعتبار سے اس کا انطباقِ نو (reapplication) کیا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ دونوں زمانہ کے فرق کو سمجھا جائے۔ مثلاً ساتویں صدی عیسوی کا زمانہ امت کا دورِ اول تھا۔ اس وقت دنیا میں تشدد کلچر (culture of violence) کا رواج تھا۔ اس لیے اس زمانے کے اہل ایمان کو دفاعی طور پر لڑائی کے میدان میں جانا پڑا۔ موجودہ زمانہ امن کلچر (culture of peace) کا زمانہ ہے۔ اس لیے اب زمانے کے تقاضے کے مطابق اسلامی مشن کی منصوبہ بندی پر امن انداز میں کرنی ہوگی۔ اگر اس فرق کو نہ سمجھا جائے تو منصوبہ بندی غلط ہو جائے گی۔ اور غلط منصوبہ بندی کا نتیجہ ہمیشہ ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

امت کی اصلاح بلاشبہ ایک اہم کام ہے۔ لیکن اصلاح کے لیے اٹھنے سے پہلے یہ دریافت کرنا ہوگا کہ حالات کی رعایت سے اصلاح کا موثر طریقہ کیا ہے۔ موثر طریقہ وہ ہے جس کا مثبت انجام برآمد ہو، جو کسی نئے مسئلے کو پیدا کیے بغیر امت کی اصلاح کا کام انجام دے۔ کوئی کام اصلاح کا ٹائٹل دینے سے اصلاح کا کام نہیں بن سکتا۔ اصلاح کا کام وہ ہے جو نتیجہ کے اعتبار سے اصلاح پیدا کرے۔ کسی کام کو جانچنے کا معیار نتیجہ ہے، نہ کہ دعوی۔

تعلق باللہ

تعلق باللہ کے سلسلے میں جو آیتیں قرآن میں آئی ہیں، ان میں سے ایک آیت یہ ہے: وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (2:186) یعنی اور جب میرے بندے تم سے میری بابت پوچھیں تو میں نزدیک ہوں، مَیں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب کہ وہ مجھے پکارتا ہے، تو چاہئے کہ وہ میری بات کو مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں، تاکہ وہ ہدایت پائیں۔

قرآن کی اس آیت میں یہ تو بتایا گیا ہے کہ اللہ پکار کا جواب دیتا ہے۔ لیکن یہ جواب کس صورت میں آتا ہے، اس کا ذکر اس آیت میں نہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے ہدایت آنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بندے کو داخلی اعتبار سے شرحِ صدر ہوجائے۔

اس شرحِ صدر کو دوسرے الفاظ میں الہام (inspiration) کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً حضرت آدم کی یہ دعا قرآن میں ان الفاظ میں مذکور ہوئی ہے: قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (7:23)۔ اس دعاء کے بارے میں غالباً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ دعاء کوئی وحی نہ تھی، بلکہ وہ الہام یا القاء کی صورت میں حضرت آدم کو حاصل ہوئی۔ اسی طرح حضرت یونس کے بارے میں آیا ہے: فَنَادَى فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ (21:87) یہ دعاء بھی بظاہر وحی نہ تھی، بلکہ وہ حضرت یونس کے خود اپنے اندر سے اعترافِ خطا کے بعد سے نکلی۔ بندہ اگر سچے دل سے اپنے رب کو پکارے۔ پھر شرح صدر کی صورت میں اس کے دل میں کوئی بات آجائے، یا وہ کوئی واضح خواب دیکھ لے، یا اس کا ذہن کسی امر کی طرف منتقل ہوجائے تو قرین قیاس یہ ہے کہ اس طرح کا ہر تجربہ اللہ کی طرف سے بطور جواب آیا ہے۔ تاہم بندے کو ایسا سمجھنے کا حق صرف اس وقت ہے جب کہ اس کا ذہن اور اس کا ضمیر اور اس کا فہم دین پوری طرح اس کی صداقت پر مطمئن ہوجائے۔

تحریک اور دعاء

تحریک (movement) دوقسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ تحریک جو عوامی بنیاد (popular base) کی بنیاد پر کھڑی ہو۔ یعنی ایک چیز جس کے لیے لوگوں کے اندر پہلے سے جذبہ موجود ہو، اس کے لیے تحریک برپا کرنا۔ ایسی تحریک میں نفسیاتی طور پر اس بات کی ضرورت نہیں ہوتی کہ داعی **باخع النفس** (26:3) بن کر اللہ سے دعا کرے۔ جو قائد عوامی جوش وخروش والے کام کے لیے کھڑا ہو اس کے پیچھے اپنے آپ لوگوں کی بھیڑ جمع ہو جائے گی۔ ایسی تحریک میں کامیابی کے لیے پر جوش خطابت کافی ہوتی ہے۔ چناں چہ جو لوگ ایسی تحریک کے لیے اٹھیں، ان کے اندر نفسیاتی طور پر یہ جذبہ پیدا ہی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مشن کی کامیابی کے لیے اللہ سے دعا کریں۔

مثلاً ریلیف ورک، سوشل ورک، ملی ورک، فلاحی ورک، اور قومی کام، وغیرہ۔ یہ وہ کام ہیں جن کا تقاضا ہمیشہ پہلے سے لوگوں کے ذہن میں شدت سے موجود ہوتا ہے۔ اس لیے اس طرح کے عوامی کام کے لیے لوگوں کو صرف کال (call) دینا کافی ہوتا ہے۔ لوگ پکار سنتے ہی اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ اس طرح کے اشو پر جب کوئی جلسہ کیا جائے تو ایسا جلسہ اپنے آپ ایک ''عظیم الشان جلسہ'' بن جاتا ہے۔

دعوت الی اللہ کا کام اس کے برعکس کام کی مثال ہے۔ دعوت الی اللہ ایک ایسا کام ہے جس کے لیے پیشگی طور پر لوگوں کے اندر جوش وخروش موجود نہیں ہوتا۔ دعوت الی اللہ کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ انسان اپنے اندر منفی سوچ کو ختم کرے، اور مثبت سوچ کو پیدا کرے۔ وہ لوگوں سے نفرت کے بجائے محبت کرنا سیکھے، وہ لوگوں کے ظلم کو بھلا کر یک طرفہ طور پر ان کا خیر خواہ بنے۔ کسی دنیوی کشش کے بغیر صرف آخرت کے جذبے کے تحت لوگوں کو اللہ کی طرف پکارنے کے لیے اٹھے۔ وہ ظالم اور مظلوم کی مساوات (equation) کو کامل طور پر چھوڑ دے، اور داعی اور مدعو کی مساوات (equation) کو دل سے اختیار کرے۔

دعوت الی اللہ کا یہ کام عوامی ذوق کے خلاف ایک کام ہے۔ اس بنا پر بنی بنائی بھیڑ اس کے لیے کبھی موجود نہیں ہوتی۔ ایسی تحریک کا ساتھ صرف وہ لوگ دیتے ہیں جو تلاشِ حق کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہوں۔ ایسے لوگ کہیں ایک جگہ موجود نہیں ہوتے۔ وہ مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اکٹھا کر کے ایک ٹیم بنانا کسی انسان کے بس میں نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے دعوت الی اللہ کی تحریک اپنے آغاز ہی سے ایک مبنی بر دعاء تحریک بن جاتی ہے۔ داعی کو اول دن سے دعا کو اپنی تحریک کا لازمی جزء بنانا پڑتا ہے۔ کیوں کہ یہ صرف اللہ عالم الغیب ہے جو جانتا ہے کہ حق کے متلاشی افراد کہاں کہاں موجود ہیں۔ وہ اس قسم کے بکھرے ہوئے افراد کو منتخب کر کے ان کو داعی کا ساتھی بنا دیتا ہے۔

ہر تحریک کی ایک نفسیات ہوتی ہے۔ ہر تحریک اپنی نفسیات کے اعتبار سے تحریک کے داعی کے اندر مخصوص مزاج بناتی ہے۔ مثلاً عوامی تحریک عملاً ایک انسان رخی تحریک ہوتی ہے۔ اس کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ کس طرح وہ بات کہی جائے جو عوام کے اندر جوش خروش پیدا کرے، اور وہ تحریک کی حمایت کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ اس کے برعکس، دعوت کی تحریک ایک خدا رخی تحریک ہوتی ہے۔ اس کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اللہ سے نصرت کی دعا کی جائے، زیادہ سے زیادہ اللہ کو اپنی مدد کے لیے پکارا جائے۔ دعوت کی تحریک میں جو درجہ اللہ کا ہوتا ہے، عوامی تحریکوں میں وہی درجہ عملاً عوام کا بن جاتا ہے۔ دعوت الی اللہ کے کام میں داعی کا کنسرن (concern) اللہ ہوتا ہے۔ جب کہ عوامی ذوق کا کام کرنے والوں کے لیے خود عوام اس کا کنسرن (concern) بن جاتے ہیں۔

عوامی تحریک کی کامیابی یہ ہے کہ عوام کی بھیڑ اس کے گرد جمع ہو جائے۔ اس کے نام پر بڑے بڑے جلسے ہونے لگیں۔ چندا دینے والے اس کے نام پر اپنی جیبیں خالی کر دیں۔ اس کے برعکس، دعوت الی اللہ کے کام کی کامیابی یہ ہے کہ وہ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَنْصُرُهٗ (22:40) کی مصداق بن جائے۔ اس کی مجالس میں فرشتے شرکت کریں۔

خواص کی ذمہ داری

ایک حدیثِ رسول میں ایک حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **من سن سنة حسنة فعمل بها، كان له أجرها ومثل أجر من عمل بها، لا ينقص من أجورهم شيئا، ومن سن سنة سيئة فعمل بها، كان عليه وزرها ووزر من عمل بها، لا ينقص من أوزارهم شيئ** (ابن ماجہ، حدیث نمبر 203) یعنی جس شخص نے ایک اچھی سنت قائم کی پھر اس نے اس پر عمل کیا، تو اس کو اپنے عمل کا اجر ملے گا، اور اس کے برابر بھی جس نے اس طریقے پر عمل کیا، بغیر اس کے کہ دوسرے عمل کرنے والے کے اجر میں کوئی کمی ہو۔ اور جس نے ایک بری سنت قائم کی اور اس پر عمل کیا، تو اس پر اس کا بوجھ ہوگا، اور ان لوگوں کا بوجھ بھی جنھوں نے اس کے طریقے پر عمل کیا، بعد والوں کے بوجھ میں کسی کمی کے بغیر۔

اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے، وہ عام لوگوں کی نسبت سے نہیں ہے بلکہ خواص کی نسبت سے ہے۔ یعنی ایسے اشخاص کی نسبت سے جو لوگوں کے لیے قابل تقلید بن جائیں، اور بعد کے لوگ ان کے نمونے کی پیروی کریں۔ آج کل کی زبان میں ایسے افراد کو ٹرینڈ سیٹر (trendsetter) کہا جاسکتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی گروہ کے خواص کی ذمے داری بہت زیادہ ہے۔ ان کو چاہیے کہ وہ کوئی کام کرنے سے پہلے بہت زیادہ سوچیں۔ کیوں کہ وہ جس کام کو کریں گے، دوسرے لوگ خود بھی ویسے ہی کرنے لگیں گے۔ یہاں تک کہ وہ رواج بڑھتا رہے گا، اور یہ ناممکن ہوجائے گا کہ لوگوں کو اس سے روکا جاسکے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواص کی ذمے داری عوام کی ذمے داری سے بہت زیادہ ہے۔ ہر سماج میں ایسا ہوتا ہے کہ کچھ افراد کو خواص کا درجہ مل جاتا ہے۔ جن کی تقلید دوسرے لوگ کریں۔ ایسے لوگوں کو اپنے عمل کے معاملے میں بے حد محتاط ہونا چاہیے۔ اس معاملے میں کوئی عذر ان کے لیے عذر نہیں بن سکتا۔

بااصول زندگی کی قیمت

مومن ایک بااصول انسان ہوتا ہے۔ بااصول زندگی کی بناپر اس کو جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، اس کو قرآن میں ایمانی آزمائش کہا گیا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کی کچھ آیتوں کے ترجمے یہ ہیں: کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالاں کہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں گزرے جو تمھارے اگلوں پر گزرے تھے۔ ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور وہ ہلا مارے گئے، یہاں تک کہ رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ یاد رکھو، اللہ کی مدد قریب ہے۔ (2:214) کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ محض یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو جانچا نہ جائے گا۔ اور ہم نے ان لوگوں کو جانچا ہے جو ان سے پہلے تھے، پس اللہ ان لوگوں کو جان کر رہے گا جو سچے ہیں اور وہ جھوٹوں کو بھی ضرور معلوم کرے گا۔ (29:2-3)

اہل ایمان پر یہ آزمائش بارش کی طرح آسمان سے نہیں آتی، بلکہ روزمرہ کی زندگی میں معمول کے حالات کے تحت آتی ہے۔ مومن کو یہ کرنا ہے کہ وہ اس آزمائش کو پہچانے اور اس میں صبر کا ثبوت دے تاکہ وہ اللہ کی نظر میں کامیاب ٹھہرے۔

قدیم زمانہ مذہبی جبر (religious persecution) کا زمانہ تھا۔ اس لیے یہ آزمائشی حالات اکثر تشدد کی صورت میں پیش آتے تھے۔ اب مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ اب اہل ایمان پر جو آزمائش آئے گی، اس کی صورت مختلف ہوگی۔

موجودہ زمانے میں اہل ایمان پر جو آزمائش آئے گی، وہ زیادہ تر نفسیاتی معنی میں ہوگی۔ یعنی ایسے حالات جو انسان کی ایگو (ego) کو بھڑکائیں، ایسے حالات جو انسان کے اندر نفرت کا جذبہ پیدا کریں، ایسے حالات جو انسان کو حق کے راستے سے دور کرنے والے ہوں، ایسے حالات جو انسان کو بددل کرنے والے ہوں، وغیرہ۔ اس قسم کے حالات میں انسان کو یہ کرنا ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو منفی سوچ سے بچائے، اور ہر حال میں اپنے آپ کو مثبت سوچ پر قائم رکھے۔

گفتگو کا علمی انداز

دو پتھروں کو ایک دوسرے سے ٹکرایا جائے تو اس ٹکرانے سے ایک تیسری چیز ظہور میں آتی ہے، اور وہ چنگاری (sparking) ہے۔ یہی معاملہ انسانی دماغ کا ہے۔ دو دماغ اگر باہم ٹکرائیں تو وہاں بھی ایک تیسری چیز ظہور میں آئے گی۔ یہ ایک نیا تصور (new idea) ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو ذہنی ارتقا (intellectual development) کہا جاتا ہے۔ ذہنی ارتقا کبھی پرسکون حالات میں پیدا نہیں ہوتا۔ ذہنی ارتقا ہمیشہ اس وقت وجود میں آتا ہے جب کہ کسی دھماکے سے کسی انسان کے اندر ذہنی طوفان (brainstorming) وجود میں آئے۔

اس معاملے میں فکری اختلاف (dissent) کا بہت بڑا رول ہے۔ دو انسانوں کے درمیان فکری اختلاف ہو اور پھر دونوں کے درمیان انتہائی آبجیکٹیو (objective) انداز میں کھلا تبادلۂ خیال (open discussion) ہو۔ دونوں کسی ریزرویشن کے بغیر خالص علمی انداز میں اپنا اپنا نقطۂ نظر بیان کریں۔ دونوں میں سے کوئی مشتعل نہ ہو، بلکہ دونوں خالص دلائل کی روشنی میں تبادلۂ خیال کریں۔

اس قسم کی گفتگو کو علمی تبادلۂ خیال (scientific discussion) کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی گفتگو اگر کامل غیر جذباتی انداز میں کی جائے تو اس کے بعد ہمیشہ یہ ہوگا کہ ایک تیسرا آئیڈیا ایمرج (emerge) کرے گا جس طرح دو پتھروں کے ٹکرانے سے ایک تیسری چیز ایمرج (emerge) کرتی ہے۔ اس مثبت اختلاف کی شرط صرف یہ ہے کہ دونوں فریقوں میں سے ہر فریق خالص دلائل کی روشنی میں اظہارِ خیال کرے، وہ الزام تراشی کی زبان ہرگز اختیار نہ کرے۔ اس قسم کی گفتگو کو قرآن میں مجادلۂ احسن (16:125) کہا گیا ہے۔ مجادلۂ احسن وہ ہے جس میں اپنی بات کو کنڈیشننگ سے اوپر اٹھ کر ریزن (reason) کی بنیاد پر کہا جائے، اور دوسروں کی بات کو کنڈیشننگ سے اوپر اٹھ کر ریزن (reason) کی بنیاد پر سنا جائے۔

سپورٹنگ رول

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے جب انسان (آدم) کو پیدا کیا تو فرشتوں کو حکم دیا کہ تم انسان کے آگے سجدہ کرو۔ یہ سجدہ، سجدۂ عبادت نہ تھا۔ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ انسان کو زمین پر آباد کیا جائے گا اور فرشتوں کو یہ کرنا ہوگا کہ وہ انسان کے ساتھ سپورٹنگ رول ادا کریں۔

حضرت نوح نے جب کشتی بنائی تو اس وقت اللہ نے ان سے کہا : وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا (11:37) یعنی اور ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق تم کشتی بناؤ۔ یہ صرف ایک کشتی کا معاملہ نہ تھا بلکہ وہ انسان کے ساتھ کیا جانے والا عام معاملہ تھا۔ انسان جب کوئی کام کرتا ہے تو وہ فرشتوں کے سپورٹ سے کرتا ہے۔ فرشتوں کے سپورٹ کے بغیر انسان کوئی کام نہیں کرسکتا۔ موجودہ زمانے میں انسان نے جو تہذیب بنائی ہے، وہ بلاشبہ انسان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ یہ کارنامہ بھی بلاشبہ فرشتوں کے سپورٹ سے انجام پایا۔ گویا کہ تہذیب کے آغاز میں اللہ نے انسان سے کہا: اصنع الحضار بأعيننا و وحينا یعنی تہذیب کی تشکیل کرو، فرشتے اس معاملے میں تمہاری مدد کریں گے۔

فطرت کا یہی اصول انسان اور انسان کے درمیان بھی مطلوب ہے۔ انسان جب کوئی بڑا کام کرتا ہے تو یہ کام بہت سے لوگوں کے تعاون سے انجام پاتا ہے۔ فطرت کے نظام کے مطابق، اس تعاون میں کسی انسان کا قائدانہ رول ہوتا ہے اور کچھ لوگوں کا سپورٹنگ رول۔ انسانی سپورٹ کے بارے میں اس اصول کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے: وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (43:32) یعنی اور ہم نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے کام لیں۔

انسانوں کے درمیان صلاحیتوں کا فرق ہے۔ یہ فرق اسی لیے ہے کہ لوگوں کے درمیان باہمی تعاون وجود میں آئے۔ اگر تمام لوگ یکساں صلاحیت کے ہوں تو تعاون ممکن نہ ہوگا۔ لوگوں کو چاہیے کہ فطرت کے اس نظام کو سمجھیں، اور اپنی صلاحیت کے مطابق اپنا رول ادا کرنے پر راضی ہوجائیں۔

چمنستانِ معرفت

جنت (Paradise) کیا ہے۔ جنت کی سب سے اعلیٰ صفت یہ ہے کہ وہ معرفت خداوندی کا چمنستان ہے۔ موجودہ دنیا بھی دنیائے معرفت ہے اور جنت بھی دنیائے معرفت۔ مگر فرق یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے مقابلے میں جنت اعلیٰ ترین معرفت کا مقام ہے۔ یہ ابدی بھی ہے اور معیاری معنوں میں دنیائے معرفت بھی۔

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک متلاشی (seeker) مخلوق ہے۔ انسان اپنے پورے وجود کے اعتبار سے کسی اعلیٰ چیز کو پانا چاہتا ہے۔ یہ اعلیٰ چیز بلاشبہ انسان کا خالق ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر انسان کی سب سے بڑی تمنا یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے خالق کو پائے، وہ اپنے خالق کو دریافت کرے، وہ اپنے خالق کی معرفت کے سائے میں زندگی گزارے، وہ ایک ایسی دنیا کو پالے جہاں اس کے اور خالق کے درمیان غیب کا پردہ باقی نہ رہے۔ وہ اپنے خالق کو اسی طرح کامل معنوں میں پالے جس طرح اس کی فطرت اس کو پانا چاہتی ہے۔

انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ خوشی (happiness) کا طالب ہے۔ مگر یہ خوشی اس کو موجودہ دنیا میں نہیں ملتی۔ یہ خوشی اپنے کامل معنوں میں جنت میں صرف ان خوش نصیب انسانوں کو ملے گی جو اللہ کی رحمت سے جنت میں داخلے کے مستحق قرار پائیں۔ جنت خدا کے ظہور کا مقام ہے۔ موجودہ دنیا میں بھی خدا اپنے صفات کے ساتھ ظاہر ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں انسان کو دیدارِ الٰہی کا کامل تجربہ نہیں ہوتا۔ اس کا سبب انسان کی اپنی کوتاہی ہے۔

موجودہ دنیا ایک ناقص دنیا ہے۔ اس کے مقابلے میں جنت کی دنیا انتہائی حد تک کامل دنیا ہوگی۔ اس لیے جنت میں اُس اعلیٰ معرفت کا حصول ممکن ہوجائے گا جس کا حصول موجودہ دنیا میں ممکن نہ تھا۔ اہل جنت کو صرف جنت میں داخلہ ہی نہیں ملے گا، بلکہ وہ اعلیٰ خصوصیت بھی ملے گی جو ان کو جنت کے اعلیٰ معیار پر صاحبِ معرفت بنادے۔

اچانک زلزلہ

26اکتوبر2015 کو ایک زلزلہ آیا۔ اس کا مرکز ہندوکش پہاڑ تھا۔ اس زلزلے کے جھٹکے پاکستان، افغانستان، نیپال اور انڈیا میں محسوس کیے گیے۔ زلزلے کے جھٹکے محسوس کرتے ہی لوگ خوف زدہ ہوگیے اور اپنے گھروں اور اپنے دفتروں سے باہر نکل آئے۔ بعض مقامات پر جانی اور مالی نقصان بھی پیش آیا۔ زلزلہ انسان کے لیے ایک بھیانک تجربہ ہے۔ زلزلہ ہمیشہ بالکل اچانک آتا ہے۔ اس لیے اس کے مقابلے میں پیشگی طور پر احتیاطی تدبیر ممکن نہیں ہوتی۔

ہمیشہ سے انسان یہ سوچتا رہا ہے کہ وہ زلزلہ سے پیشگی طور پر آگاہ ہوجائے تاکہ اس سے بچنے کی تدبیر کی جاسکے۔ موجودہ سائنسی دور میں مزید اضافہ کے ساتھ اس معاملے کی تحقیق کی گئی۔ مگر ابھی تک اس معاملے میں کوئی حقیقی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ 1970 کی دہائی میں سائنس داں یہ سمجھتے تھے کہ وہ زلزلے کی پیشگی علامت کو دریافت کرلیں گے۔ مگر تحقیق میں مسلسل ناکامی کے بعد 1990 کی دہائی میں یہ مان لیا گیا کہ زلزلہ کے آمد کی پیشگی خبر سائنسی طور پر جاننا ناممکن ہے، حتی کہ ایک سکنڈ پہلے بھی نہیں:

> In the 1970s, scientists were optimistic that a practical method for predicting earthquakes would soon be found, but by the 1990s continuing failure led many to question whether it was even possible...many others now maintain that earthquake prediction is inherently impossible.

قرآن میں قیامت کو بڑا زلزلہ (22:1) بتایا گیا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قیامت کا زلزلہ بالکل اچانک (43:66) آئے گا۔ اس کے مطابق، زمین پر آنے والے موجودہ زلزلے گویا چھوٹے زلزلے ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں قیامت ایک زلزلۂ عظیم ہے۔ زلزلۂ صغیر اس لیے آتا ہے کہ انسان بیدار ہوجائے، اور زلزلۂ عظیم کی پیشگی تیاری کرے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ زلزلۂ عظیم اچانک آجائے جب کہ انسان نے اس کی کوئی تیاری نہ کی ہو۔

پست ہمتی نہیں

قرآن میں اہل ایمان کی ایک صفت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ۔ (3:146) یعنی اللہ کی راہ میں جو مشکلات ان پر آئیں، ان سے نہ وہ پست ہمت ہوئے، نہ انھوں نے کمزوری دکھائی۔ اور نہ وہ دبے۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ آیت میں سبیل اللہ سے مراد سبیل الجہاد نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق زندگی کے حالات سے ہے۔ یعنی ناموافق حالات میں صبر کی روش پر قائم رہنا اور کسی حال میں پست ہمت نہ ہونا۔

میدانِ جنگ (battlefield) کا مسئلہ تو کبھی پیش آتا ہے، اور کبھی پیش نہیں آتا۔ اس آیت کا تعلق اس قسم کے اتفاقی واقعے سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق روزمرہ کی زندگی سے ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو آزادی ملی ہوئی ہے۔ اس بنا پر دنیا ہمیشہ مسائل کا جنگل بنی رہتی ہے۔ ایسی دنیا میں ایک بااصول انسان کے لیے زندگی گزارنا گویا جھاڑی کے درمیان سفر کرنا ہے۔ بااصول انسان اگر حالات سے گھبرا جائے تو وہ اپنے اصول پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کا حل صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے، مسائل پر صبر کرنا اور اپنے ذہن کو ہمیشہ اصول پر جمائے رکھنا۔

صبر کا تعلق کسی ایک معاملے سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق تمام معاملے سے ہے — درست طور پر سوچنا، درست طور پر بولنا، درست طور پر عمل کرنا، لوگوں کے ساتھ تعلقات میں درست رویہ پر قائم رہنا۔ ہر چیز کا تعلق صبر سے ہے۔ صبر کا مطلب عزم سے ہے۔ باعزم انسان وہ ہے جو صابر انسان ہو۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ ایک باعزم انسان بنے۔ وہ کسی بھی معاملے میں اپنے عزم کو نہ کھوئے۔

صبر بامقصد انسان کے لیے ایک اعلیٰ اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ صبر کے بغیر، بامقصد زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ صبر واحد چیز ہے جو ایک بامقصد انسان کو ہر حال میں اپنے مقصد پر قائم رکھتا ہے۔ صبر نہیں تو بامقصد زندگی بھی نہیں۔

فکر کی تشکیل

اکثر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کی فکری شخصیت کیسے بنی۔ وہ کون عالم یا مفکر ہے جس سے آپ سب سے زیادہ انسپائر (inspire) ہوئے۔ آپ کی فکر کی تشکیل میں سب سے زیادہ اثر کس شخصیت کا ہے۔ میرا جواب ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی مسلم یا غیر مسلم اسکالر یا تھنکر ایسا نہیں ہے جس کے مطالعے سے میری فکری شخصیت کی تشکیل ہوئی ہو۔

میری پرورش ابتداءً فطرت (nature) کے ماحول میں ہوئی۔ اس کے بعد میں نے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کتابوں کا وسیع مطالعہ کیا۔ یہ مطالعہ غیر متعصّبانہ انداز میں تھا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس مطالعے نے مجھ کو جو سب سے بڑا تحفہ دیا، وہ موضوعی طرزِ فکر (objective thinking) کا تحفہ تھا۔ اس طرزِ فکر کو دوسرے الفاظ میں ایزاٹ از تھنکنگ (as it is thinking) کہا جا سکتا ہے۔ مذہبی مطالعہ اور سیکولر مطالعہ، دونوں قسم کے مطالعہ میں یہی اصول میرا رہنما اصول رہا ہے۔ اسی اصول سے میں نے اسلام کو اس کے گہرے معنی کے اعتبار سے سمجھا۔ اسی اصول کی بنا پر مجھے مغربی فکر (Western thought) کی صحیح معرفت حاصل ہوئی۔

ابتداءً یہ اصول مجھے مغربی سائنس کے مطالعے سے ملا تھا۔ مزید مطالعے کے بعد میں نے دریافت کیا کہ یہ اصول ایک حدیث رسول میں نہایت واضح انداز میں موجود ہے۔ ایک روایت کے مطابق پیغمبر اسلام نے اپنی دعا میں فرمایا: اے اللہ، ہمیں حق کو حق کی صورت میں دکھا، اور ہم کو اس کی اتباع کی توفیق دے، اے اللہ، ہمیں باطل کو باطل کی صورت میں دکھا، اور ہم کو اس سے بچنے کی توفیق دے۔ اور اے اللہ، ہمیں چیزوں کو ویسے ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں۔

میں اپنے تجربے کے مطابق کہہ سکتا ہوں کہ موضوعی تفکیر (objective thinking) بے حد مشکل کام ہے۔ اس کو درست طور پر حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ آدمی کامل معنوں میں اپنی ڈی کنڈیشننگ (deconditioning) کرے۔ یہی حقیقت کو پانے کا اصل سرا ہے۔

کوئی دشمن نہیں

پچھلے زمانے میں کوئی کسی کا دوست ہوتا تھا، اور کوئی کسی کا دشمن۔ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اب کوئی نہ کسی کا دوست ہے، اور نہ کوئی کسی کا دشمن۔ اب ہر آدمی پروسیلف (pro-self) ہے۔ ہر آدمی کا ایک ہی کنسرن (concern) ہے۔ اور وہ اس کا اپنا انٹرسٹ ہے۔ آج کا انسان اپنے انٹرسٹ میں اتنا گم ہے کہ اس کو کسی اور کے خلاف سوچنے کی فرصت نہیں۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا فرق کا سبب یہ ہے کہ قدیم زمانے میں مواقع (opportunities) بہت محدود ہوتے تھے۔ مواقع پر ایک مراعات یافتہ طبقہ (privileged class) کا قبضہ ہوتا تھا۔ موجودہ زمانے میں اصولی طور پر یہ صورتِ حال ختم ہوگئی ہے۔ اب تمام مواقع ہر آدمی کے لیے کھل گیے ہیں۔ اس لیے ہر آدمی اپنے انٹرسٹ کے لیے دوڑ رہا ہے۔ ذاتی انٹرسٹ کے اس دوڑ میں کسی کے پاس دوسرے کے خلاف سوچنے کا وقت نہیں۔ کسی کے پاس دوسرے کے خلاف دشمنی اور سازش کرنے کا وقت نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دشمنی کا لفظ دور جدید کی ڈکشنری سے عملاً حذف ہوچکا ہے۔ اب اگر کوئی کسی کا دشمن بنتا ہے تو وہ اس وقت بنتا ہے جب کہ اس کو "پتھر" مار کر اس کو مشتعل کر دیا جائے۔ اگر آپ آبیل مجھے مار کی سیاست اختیار کرکے کسی کے ایگو (ego) کو چھیڑ دیں تو وہ ضرور آپ کو سینگ مارے گا۔ اگر آپ مکمل طور پر پر امن بن جائیں تو کوئی شخص نہ آپ کا دشمن ہوگا، اور نہ کوئی شخص آپ کے خلاف سازش کرے گا۔

ایک حدیث رسول موجودہ زمانے میں مزید اضافہ کے ساتھ صادق آتی ہے: **الفتنة نائمة لعن اللہ من أیقظها** (کنز العمال، حدیث نمبر 30891) یعنی فتنہ سویا ہوا ہے، اس پر اللہ کی لعنت ہو جو اس کو جگائے — ہوش مندی کے ساتھ زندگی گزاریے، اور پھر آپ کو کسی سے دشمنی کا تجربہ نہ ہوگا۔

دردِ جنت

ذوق دہلوی (وفات:1854) ایک اردو شاعر تھے۔ وہ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے درباری شاعر تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے ان کو خاقانِ ہند کا لقب دیا تھا۔ ذوق دہلوی کا ایک شعر یہ ہے:

دردِدل کے واسطے پیدا کیا انسان کو   ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

دردِ دل ایک منفی صفت ہے۔ انسان جیسی اعلیٰ مخلوق کا مقصد حیات یقینی طور پر کوئی مثبت نشانہ ہونا چاہیے۔ اس اعتبار سے غور کیجیے تو انسان کا نشانہ صرف جنت ہونا چاہیے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہوگا:

دردِ جنت کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ہر انسان پیدائشی طور پر ایک اعلیٰ زندگی کی تلاش میں ہوتا ہے۔ مگر وہ اس اعلی زندگی کو پائے بغیر مرجاتا ہے۔ یہ اعلی زندگی، جنت کی زندگی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر انسان طالب جنت کی حیثیت سے اس دنیا میں آتا ہے، لیکن وہ ساری کوشش کے باوجود جنت کو نہیں پاسکتا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مچھلی کو اگر صحرا (desert) میں ڈال دیا جائے تو وہ وہاں تڑپے گی۔ پھر اگر اس کو پانی میں ڈال دیا جائے تو اس کی تڑپ ختم ہوجائے گی۔ مچھلی اپنی فطرت کے اعتبار سے پانی کی طالب تھی۔ پھر جب اس کو پانی مل گیا تو وہ ایسی ہوگئی، جیسے اس کو سب کچھ مل گیا۔ اس دنیا کے خالق نے جس چیز کو مچھلی کے لیے مقدر کیا ہے، وہ مطلوب انسان کے لیے مقدر نہیں۔ یقینا انسان کے لیے بھی اس کا ''پانی'' مقدر ہے۔ لیکن وہ مستحق انسان کے لیے موت کے بعد کے عرصۂ حیات میں ہے، نہ کہ موت سے پہلے کے عرصۂ حیات میں۔

لوگوں کو جنت کا علم ہے، لیکن انھیں جنت کا شعوری ادراک نہیں۔ اگر ان کو جنت کا شعوری ادراک ہو تو جنت کے سوا کوئی اور چیز ان کو مطمئن نہ کرے۔

اچانک پیشی

موت لازماً ہر انسان پر آتی ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بیمار ہوتا ہے، وہ حادثے کا شکار ہوتا ہے، وہ خرابیٔ صحت کی بنا پر بیڈ ریڈن (bedridden) ہوجاتا ہے۔ اور آخر میں پھر مرجاتا ہے۔ مگر کچھ موتیں ایسی ہیں جو اچانک آتی ہیں۔ جیسے انڈیا کے مشہور سائنسداں ڈاکٹر عبدالکلام جو 27 جولائی 2015 کو اچانک شیلانگ میں وفات پاگیے۔ اس وقت وہ اسٹیج پر کھڑے ہوکر اپنا لکچر دے رہے تھے۔ آخری جملہ وہ مکمل نہیں کر پائے تھے کہ ان کا خاتمہ ہوگیا۔

اچانک موت کا مطلب اچانک پیشی ہے۔ اچانک موت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کا حساب دینے کے لیے اچانک مالک یوم الدین کی عدالت میں حاضر کردیا جائے۔ ایک ایسے مقام پر جس کے بارے میں حدیث میں آیا ہے: **ما منكم من أحد إلا وسيكلّمه الله يوم القيامة، ليس بين الله وبينه ترجمان** (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6539)۔ یعنی تم میں سے ہر ایک سے ضرور اللہ کلام کرے گا، اس طرح کہ اللہ اور انسان کے درمیان کوئی ترجمان نہ ہوگا۔

ہر آدمی پر لازماً موت کا لمحہ آنے والا ہے۔ خواہ وہ لمحہ اچانک آئے یا تاخیر کے ساتھ آئے۔ یہ تصور انسان کو ہلا دینے والا ہے کہ وہ بے اختیار و مددگار حالت میں ایک دن اپنے آپ کو اس طرح پائے گا کہ ایک طرف وہ ہے اور دوسری طرف اللہ رب العالمین۔ اس پیشی کے بارے میں عمر بن خطاب نے فرمایا: **تجهّزوا للعرض الأكبر** (الزہد والرقائق لابن المبارک: 306) یعنی بڑی پیشی کے لیے تیاری کرو۔

بڑی پیشی کے لیے تیاری یہ ہے کہ آدمی اس سوچ کے ساتھ جئے کہ اس کو کوئی ایسی بات نہیں کرنا ہے جو اللہ رب العالمین کی عدالت میں قبول ہونے والی نہ ہو۔ وہ اپنے قول اور اپنے عمل کا اس اعتبار سے نگراں بن جائے۔ وہ اپنا محاسبہ آپ کرنے لگے۔ وہ شام کو سوئے تو اسی احساس کے ساتھ سوئے، اور صبح کو جاگے تو اسی احساس کے ساتھ جاگے۔

سازش کیا ہے

سازش (conspiracy) منفی کارروائی کی ایک قسم ہے۔ اس کا مطلب ہے کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے اس کے خلاف خاموش تدبیر کرنا:

Secret planning for some harmful purpose.

یہ طریقہ پوری تاریخ میں جاری رہا ہے۔ کسی مشن کے مخالفین ہمیشہ دو طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ ایک ہے کھلے طور پر اس کے خلاف عداوتی کارروائی کرنا۔ اور دوسرا ہے خاموش تدبیر کے ذریعے اس کو زیر کرنے کی کوشش کرنا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں دونوں قسم کی مخالفت کی مثالیں ملتی ہیں۔ قدیم مکہ کے قریش نے آپ کے خلاف کھلی دشمنی کی۔ قدیم مدینہ کے یہود بھی آپ کے مخالف تھے لیکن انھوں نے اپنی مخالفانہ کارروائیاں خاموش تدبیر کے انداز میں کیں۔

سازش دراصل بزدلانہ مخالفت کا دوسرا نام ہے۔ سازش ہمیشہ وہ لوگ کرتے ہیں جو منافقانہ کردار کے حامل ہوں۔ یعنی اوپر سے بظاہر اچھے بنے رہنا، مگر اندر سے عناد (malice) رکھنا، اور عناد کے جذبے کے تحت خاموش انداز میں منفی تدبیریں کرنا۔ منفی تدبیر کا نشانہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی بظاہر اچھا بنا رہے، لیکن اندر سے وہ منصوبہ بند انداز میں معاندانہ کارروائی کرے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ سازش کا طریقہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا (35:10)۔ یہ بات دنیا کے اعتبار سے ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سازش کرنے والا خود تو اپنے عناد کی بنا پر، اپنی سازشی تدبیر کی کمزوری سے بے خبر رہتا ہے، لیکن دوسرے لوگ جو کہ عناد کی نفسیات سے خالی ہوں، وہ اس کی بات کو عقل (reason) کی سطح پر جانچتے ہیں۔ جب وہ پاتے ہیں کہ اس کی باتوں میں کوئی معقولیت نہیں ہے تو وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ معاند کو اپنے عناد کی بنا پر جو خامی نظر نہیں آتی، وہ غیر معاند کو اپنی بے آمیز نفسیات کی بنا پر بآسانی دکھائی دیتی ہے۔ اس بنا پر سازشی انسان کی سازش دوسروں کی نسبت سے عملاً غیر موثر ہو کر رہ جاتی ہے۔

ذہین انسان کا مسئلہ

لارڈ کرزن (Lord Curzon) 1899 سے 1905 تک انڈیا میں برٹش وائسرائے تھے۔ وہ نہایت ذہین آدمی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کسی کو اپنا برابر (equal) نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ اکثر ان کا لوگوں سے جھگڑا (quarrel) ہوجاتا تھا۔ اپنی آخری عمر میں لارڈ کرزن شدید قسم کی بیماریوں کا شکار ہوئے۔ وہ مایوسی کی حالت میں لندن میں 20 مارچ 1925 کو وفات پاگیے۔ بوقت وفات ان کی عمر 66 سال تھی۔ تجربہ بتاتا ہے کہ جو شخص زیادہ ذہین ہو، وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو اتنا بڑا سمجھ لیتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کو اپنا ہم سر دکھائی نہیں دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسروں سے نصیحت لینے اور دوسروں سے سیکھنے کا مزاج اس کے اندر ختم ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے آپ میں جینے لگتا ہے۔ چناں چہ ذہانت کے باوجود وہ کوئی بڑا کام نہیں کرپاتا۔

ذہانت فطرت کا ایک قیمتی تحفہ ہے، مگر ذہین آدمی اسی وقت کوئی بڑا کام کرپاتا ہے کہ جب کہ ذہانت کے ساتھ اس کے اندر تواضع (modesty) کی صفت پائی جائے۔ جس انسان کے اندر ذہانت ہو، مگر اس کے اندر تواضع نہ ہو، وہ اپنے آپ کو درست طور پر استعمال (utilise) نہیں کرپائے گا۔ اس کو دوسروں سے صرف شکایت ہوگی۔ وہ ہر ایک سے نفرت کرنے لگے گا۔ اس کے برعکس، جس آدمی کے اندر ذہانت کے ساتھ تواضع کی صفت پائی جائے، وہ اس قابل ہوگا کہ اپنی ذہانت کو بھرپور طور پر استعمال کرے۔ وہ دوسروں کے لیے بڑے پیمانے پر کوئی مفید کام انجام دے۔ تواضع وہ ہے جو کہ حقیقی تواضع ہو، نہ کہ ظاہری تواضع۔

ذہانت خالق کی ایک عظیم نعمت ہے، جو کسی انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ مگر صرف ذہانت کافی نہیں۔ ذہانت کسی آدمی کو خالق کی طرف سے ملتی ہے، لیکن دوسری ضروری صفات آدمی کو خود اپنی کوشش سے اپنے اندر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً تواضع کی صفت، دوسروں سے سیکھنے کا جذبہ، دوسروں کے لیے خیر خواہ ہونا، دوسروں سے معتدل انداز میں ملنا، ہر ایک کو قابلِ عزت سمجھنا، وغیرہ۔

اعترافِ حقیقت

شاہ فاروق مصر کی علوی سلطنت کے بادشاہ تھے۔ آخری زمانے میں ان کے خلاف فوجی بغاوت ہوئی۔ 1952 میں ان کو تخت سے محروم کرکے اٹلی بھیج دیا گیا۔ جہاں 1965 میں ان کی وفات ہوئی۔ جب ان کی بادشاہت ان سے چھن گئی تو اس وقت انھوں نے ملک چھوڑتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اب دنیا سے بادشاہت کا دور ختم ہوگیا، آئندہ دنیا میں صرف پانچ بادشاہ ہوں گے — چار تاش کا اور ایک برطانیہ کا:

> ‘The whole world is in revolt, soon there will be only five kings left: the king of spades, the kingof clubs, the king of hearts, the king of diamonds, and the king of England.’

شاہ فاروق کی تخت سے معزولی کو عام طور پر فوجی انقلاب (military coup) کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ عالمی سیاسی انقلاب کا نتیجہ تھا۔ بیسویں صدی عیسوی میں جمہوری انقلاب آیا۔ اس کے بعد شخصی بادشاہت کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ شاہ فاروق عربی زبان کے علاوہ فرانسیسی زبان بھی جانتے تھے۔ انھوں نے دورِ حاضر کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ تاریخ کے بارے میں اپنے مطالعہ کے ذریعے جان چکے تھے کہ اب شخصی بادشاہت کا دور ختم ہوچکا ہے۔ اس واقفیت کی بنا پر انھوں نے اپنی معزولی کو ایک ہونے والا واقعہ سمجھا۔ اس لیے انھوں نے اس کو ایک حقیقت کے طور پر مان لیا۔ اس اعترافِ حقیقت کی بنا پر وہ منفی نفسیات کا شکار ہونے سے بچ گیے۔ انھوں نے اپنی بقیہ عمر جلاوطنی میں پرسکون طور پر گزاری۔

یہی زندگی کا راز ہے۔ زندگی میں آخری طور پر جو چیز باقی رہتی ہے، وہ ہماری آرزوئیں اور خواہشیں نہیں ہیں بلکہ فطرت کا قانون ہے۔ یہ قانون ہر فرد اور گروہ پر یکساں طور پر نافذ ہوتا ہے۔ اگر انسان اس حقیقت کو جان لے تو وہ غصہ اور شکایت اور احتجاج اور تشدد سے اپنے آپ کو بچا لے۔

اعراض کی حکمت

اعراض (avoidance) زندگی کا ایک اہم اصول ہے۔ اعراض کا تعلق دعوتی مشن سے بھی ہے اور زندگی کے دوسرے معاملات سے بھی۔ اعراض کے اصول کو اختیار کیے بغیر اس دنیا میں کوئی بھی کام درست طور پر انجام نہیں دیا جاسکتا۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہر فرد اور ہر قوم کو خالق کی طرف سے آزادی حاصل ہے۔ ہر آدمی کو یہ موقع ہے کہ وہ اپنی سوچ کے مطابق اپنی آزادی کا استعمال کرے۔ زندگی کا یہی وہ معاملہ ہے جس کی بنا پر لوگوں کے درمیان اختلافات (differences) پیدا ہوتے ہیں۔ اختلاف اجتماعی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے جس کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔

ایک شخص جس کی زندگی کا ایک مشن ہو، اس کو جاننا چاہیے کہ مشن کا لازمی اصول یہ ہے کہ آدمی اختلافی امور کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا مشن چلائے۔ وہ دوسرے لوگوں سے الجھے بغیر مثبت ذہن کے ساتھ اپنے منصوبے کی تکمیل میں لگا رہے۔

اعراض کے اصول کی اہمیت جتنی دوسرے معاملات میں ہے، اس سے بہت زیادہ دعوت کے معاملے میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کا کام اعراض کے بغیر عملاً ممکن نہیں۔ دعوت کا نشانہ لوگوں کو آخرت سے باخبر کرنا ہے۔ اس مشن کو درست طور پر انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ داعی کے اندر یکسوئی کا مزاج ہو۔ اس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ اہل دنیا کی طرف سے چھیڑے ہوئے مسائل کو مکمل طور پر نظر انداز (ignore) کرے۔ اور پوری یکسوئی کے ساتھ لوگوں کو آخرت کی طرف پکارتا رہے۔ جو لوگ دعوت کا نام لیں لیکن وہ اہل دنیا کی طرف سے چھیڑے ہوئے مسائل میں الجھے رہیں، وہ کبھی خدا کے یہاں داعی کا مقام حاصل نہیں کرسکتے۔ ایسے لوگوں کی کوششیں دنیا میں حبطِ اعمال (18:104) کا شکار ہوجائیں گی، وہ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالآخِرَة (22:11) کا مصداق ہوکر رہ جائیں گی۔

سوال و جواب

سوال

عام تاثر یہ ہے کہ پوری دنیا کی غیر مسلم قومیں مسلمانوں کے در پے ہیں، اور مسلم دنیا سازشوں کے نرغے میں ہے۔ کیا یہ صحیح ہے، اور اگر یہ صحیح ہے تو اس کا حل کیا ہے۔ (ایک کشمیری، سری نگر)

جواب

اس قسم کی سوچ بلاشبہ غلط ہے۔ کیوں کہ وہ فطرت کے قانون کے خلاف ہے۔ موجودہ دنیا کو امتحان کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ اس لیے انسان کو خود خالق نے مکمل آزادی عطا کی ہے۔ اور جب آدمی اپنی آزادی کو استعمال کرے گا تو وہ صرف اپنے انٹرسٹ کو دیکھے گا، وہ دوسرے کے انٹرسٹ کو دیکھ کر اپنا منصوبہ نہیں بنائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک کی آزادی دوسرے کے لیے مسئلہ بن جاتی ہے۔ ایسی حالت میں دوسرے انسان کے لیے صرف یہ چوائس ہے کہ وہ اس قسم کے مسئلے کو چیلنج سمجھے۔ اور دوسرے سے لڑائی یا نفرت کیے بغیر اپنے لیے ترقی کا راستہ نکالے۔

یہ بات قرآن میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے: وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ ۔ (3:120) یعنی اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کا طریقہ اختیار کرو تو ان کی کوئی سازش تم کو نقصان نہ پہنچائے گی۔ اس آیت میں جو رہنمائی دی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر تم کو دوسروں کی طرف سے کوئی مسئلہ پیدا ہو تو اس کو سازش بتا کر احتجاج (protest) نہ کرو۔ بلکہ صورتِ حال کا بے لاگ مطالعہ کرکے مثبت بنیادوں پر اپنی زندگی کی تعمیر کرو۔ زندگی کے مواقع جس طرح ایک شخص کے لیے کھلے ہوئے ہیں، اسی طرح وہ دوسرے شخص کے لیے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ اس لیے کرنے کا اصل کام مواقع کو استعمال کرنا ہے، نہ کہ دوسرے کے خلاف چیخ و پکار کرنا۔

کسی کو دشمن بتا کر اس کے خلاف چیخ و پکار کرنا، باعتبار نتیجہ صرف اپنی تباہی میں اضافہ کرنا ہے۔ کیوں کہ یہ ملے ہوئے وقت کو ضائع کرنے کے ہم معنی ہے۔ اس دنیا میں کامیابی کا راز صرف ایک ہے اور وہ ہے — حالات کے مطابق درست منصوبہ بندی۔

سوال

دعوۃ ورک اور سوشل ورک میں فرق کیا ہے، کیا انبیاء نے دعوۃ ورک کے ساتھ سوشل ورک بھی کیا ہے؟ (حافظ سید اقبال احمد عمری، عمر آباد، تامل ناڈو)

جواب

سوشل ورک انسانی خدمت کے اعتبار سے ایک اچھا کام ہے۔ لیکن سوشل ورک امتِ مسلمہ کا اصل مشن نہیں۔ سوشل ورک لوگوں کو مسائلِ دنیا سے بچانے کے لیے ہوتا ہے۔ جب کہ پیغمبر کا نشانہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو مسائلِ آخرت سے بچایا جائے۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت پر غور کیجئے جس کا ترجمہ یہ ہے: وہ بلند درجوں والا، عرش کا مالک ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے وحی بھیجتا ہے، تا کہ وہ ملاقات کے دن سے ڈرائے (40:15)۔ اس مضمون کی آیتیں قرآن میں کثرت سے آئی ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ امت کا اصل نشانہ دعوت الی اللہ یا اُس ہدایت کو لوگوں تک پہنچانا ہے جو اللہ کی طرف سے لوگوں کے لیے اتاری گئی ہے۔ (5:67)

دونوں قسم کے کاموں میں جو فرق ہے، ان میں سے ایک اہم فرق یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کے کام میں داعی کے اندر تعلق باللہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اپنے عمل کے دوران وہ اللہ کو یاد کرتا ہے، اللہ سے دعائیں کرتا ہے، اللہ سے رہنمائی کا طالب ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، سوشل ورک میں تعلق بالناس کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، ساری توجہ انسانوں کی طرف چلی جاتی ہے۔ دعوت الی اللہ کے کام میں اگر خدا رخی ذہن بنتا ہے تو سوشل ورک میں فطری طور پر انسان رخی ذہن کی پرورش ہوتی ہے۔ دعوت الی اللہ کے کام میں اگر فرشتوں کی صحبت حاصل ہوتی ہے تو سوشل ورک میں ساری توجہ کا مرکز انسان بن جاتا ہے۔ دعوت الی اللہ میں مشغول لوگوں کے اندر اگر جنت اور جہنم کا چرچا ہوتا ہے تو سوشل ورک میں مشغول لوگوں کے اندر انسانوں سے متعلق خبروں کا چرچا ہونے لگتا ہے۔ دعوت الی اللہ کے کام میں اگر کیفیت (quality) کی اہمیت ہوتی ہے تو سوشل ورک میں ساری اہمیت کمیت (quantity) کی ہو جاتی ہے۔

1— اگر دعوت کا کام پر امن انداز میں کیا جائے تو موجودہ دور میں مدعو خود آپ کو بلائے گا۔ اس کی ایک مثال دیکھیے۔ 4 جون 2015 کو سہارن پور کے ڈی آئی جی جناب ڈاکٹر اشوک کمار راگھو (آئی پی ایس) نے سی پی ایس ٹیم کو اپنے آفس میں انوائٹ کیا۔ اس مناسبت سے سی پی ایس (سہارن پور) ٹیم کی محترمہ الپنا تلوار اور سوامی پریم وکرم، ڈاکٹر ذوالفان، دانش خان اور مزجیوتی، وغیرہ وہاں گیے۔ انھوں نے ڈاکٹر اشوک کمار کو انگلش تذکیر القرآن دیا۔ اور ساتھ ہی ان کے سٹاف کے لئے بھی ہندی کا ترجمۂ قرآن دیا۔ بہت ہی اچھے ماحول میں تقریباً ایک گھنٹے تک سائنس آف گاڈ کے ٹاپک پر گفتگو ہوتی رہی جو کہ کافی نتیجہ خیز رہی۔

2— 15 اگست 2015 کو الحمد اسکول اور بلگچھیا اینگلو—اردو پرائمری اسکول کے اساتذہ سے کولکاتا سی پی ایس ٹیم کی ایک ممبر محترمہ شبینہ علی نے انٹرایکشن کیا اور ان کے درمیان دعوہ لٹریچر تقسیم کیا— یہ پروگرام بہت ہی نتیجہ خیز رہا۔

3— عیدالاضحیٰ کے موقع پر 25 ستمبر کو صدر اسلامی مرکز نے ایک خطاب کیا۔ اس میں سی پی ایسی دہلی کے ممبران شریک ہوئے— اس موقع پر آپ نے جو خطاب کیا اس کو سی پی ایس کی ویب سائٹ پر سنا جا سکتا ہے:

http//:www.cpsglobal.org/content/interview-eid-ul-adha-september-25—2015

4— نیشنل میڈیکل کالج (سہارن پور) کی جانب سے کانوڑیوں کے لئے فری میڈیکل کیمپ کا انعقاد کیا گیا تھا— اس موقع پر بیمار کانوڑیوں نے اپنا علاج کرواتے وقت ہندی قرآن اور صدر اسلامی مرکز کی کتاب ''ستیہ کی کھوج'' حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ کالج کی ایڈمشن کاؤنسلر مسز الکا چودھری اور ڈاکٹر محمد اسلم خاں نے ان کو صدر اسلامی مرکز کا ہندی ترجمۂ قرآن اور دعوتی لٹریچر پیش کیا جن کو ان لوگوں نے بہت ہی خوشی کے ساتھ قبول کیا۔

5— یکم اکتوبر 2015 تا 11 اکتوبر 2015 لکھنؤ میں بک فیئر لگا۔ اس بک فیئر کا افتتاح جناب رام نائیک (گورنر آف یوپی) کے ہاتھوں ہوا۔ اس بک فیر میں سی پی ایس لکھنؤ کی ٹیم نے سی پی ایس سہارنپور کے تعاون سے ایک اسٹال لگایا— اس اسٹال پر مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی بڑی تعداد میں آئے۔ ان کے ساتھ سی پی ایس ٹیم نے انٹرایکشن کیا اور ان کے درمیان بڑی تعداد میں دعوہ لٹریچر تقسیم کیا۔ اس درمیان اتر پردیش کے گورنر کے علاوہ جن اہم لوگوں کو دعوۃ لٹریچر اور صدر اسلامی مرکز کی نئی کتاب دی ایج آف پیس دی گئی وہ ہیں، یوپی گورنمنٹ کے کیبنٹ منسٹر جناب آر کے چودھری، آئی ایف ایس ڈاکٹر اے کے دیویدی اور یوپی گورنمنٹ کے جوائنٹ سکریٹری جناب اوم پرکاش، وغیرہ۔

6— 22 اکتوبر 2015 کو صدر اسلامی مرکز، سی پی ایس ممبر پروفیسر نجمہ صدیقی کے گھر (ماڈل ٹاؤن) تشریف لے گئے۔ صدر اسلامی مرکز کے ساتھ سی پی ایس (دہلی) کی ایک ٹیم بھی تھی۔ اس مناسبت سے صدر اسلامی مرکز نے ''تلافیٔ مافات کا قانون'' کے عنوان سے ایک تقریر کی۔ یہ تقریر سی پی ایس انٹرنیشنل کی ویب سائٹ پر اس لنک پر سنی جا سکتی ہے:

http//:www.cpsglobal.org/content/law-recovery-october-22—2015

7– چند فلسطینی نوجوان مسجد اقصی اور اس کے اطراف میں سیاحوں اور نان مسلموں کے درمیان صدر اسلامی مرکز کا انگلش ترجمہ قرآن اور ’’وہاٹ از اسلام‘‘ تقسیم کرتے ہیں۔ انھوں نے یہ خبر دی ہے کہ ’’وہاٹ از اسلام‘‘ کو اسرائیل کے یہود بہت پسند کرتے ہیں۔ اور انھوں نے از خود اس کتاب کا عبرانی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور لوگوں کو دینے کے لیے انھوں نے اسے طبع کروایا ہے۔

8– ناگپور کا میپٹی الرسالہ ٹیم کے ممبران نے ناگپور کے انگریزی روزنامہ ’دی ہتوادا‘ کے ایڈیٹر جناب وجے پھانسلکار (Vijay Phansilkar) سے ملاقات کی اور ان کو انگلش ترجمۂ قرآن اور دوسری مولانا کی کتابیں پیش کیں۔ ایڈیٹر موصوف نے ان کو بے حد مسرت اور شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں مولانا کا بہت احترام کرتا ہوں، اور ان سے ممبئی میں ایک بار مل چکا ہوں۔

9– پونا بک فیئر 15 اکتوبر سے 18 اکتوبر تک منعقد ہوا۔ اس میں پونا سی پی ایس ٹیم کے عبد الصمد صاحب نے ممبئی سی پی ایس ٹیم کے تعاون سے ایک بک اسٹال لگایا۔ اس مناسبت سے یہاں تشریف لانے والے وزیٹرس اور اسٹال مالکان کے درمیان دعوہ لٹریچر تقسیم کئے۔ ممبئی ٹیم سے ڈاکٹر جنید، اجمل خان صاحب، فاروق فیصل صاحب نے اس بک فیئر میں شرکت کی۔ یہاں بہت سارے ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جو صدر اسلامی مرکز کو آن لائن انگلش ڈیلی دی اسپیکنگ ٹری کے حوالے سے جانتے ہیں۔ جیسے کمل کوٹھاری صاحب، وغیرہ یہ لوگ صدر اسلامی مرکز کی تحریروں کو پڑھتے ہیں، اور اپنے متعارفین کے درمیان پھیلاتے ہیں۔

10– آرین ٹی وی نیوز چینل نے 13 اکتوبر 2015 کی شام 8 بجے ’’یونی فارم سول کوڈ‘‘ پر ایک لائیو ڈسکشن (live discussion) کا پروگرام منعقد کیا۔ اس میں انھوں نے اسلام کے نمائندے کے طور پر سی پی ایس بہار و جھارکھنڈ کے صدر جناب دانیال صاحب کو مدعو کیا تھا۔ پروگرام کے بعد تمام لوگوں کے درمیان ترجمۂ قرآن، وہاٹ از اسلام اور دوسرے دعوتی لٹریچر تقسیم کئے گئے۔

11– گورنمنٹ ڈگری کالج، پونچھ، میں سرسید ڈے کے موقع پر ایک پروگرام منعقد کیا گیا۔ اس پروگرام میں جج، سیاست دان، پروفیسرس، اساتذہ، سوشل ورکرز، اسکالرز اور کالج کے طلباء وغیرہ شامل ہوئے تھے۔ اس موقع پر سی پی ایس (جموں) کی جانب سے تمام لوگوں کو ’دی ایج آف پیس، اسپرٹ آف اسلام، انڈین مسلم‘، اور صدر اسلامی مرکز کا ایک مضمون ’’سرسید فارمولا‘‘ اور دوسری کتابیں بطور تحفہ دیا گیا۔

12– ٹورنٹو (کناڈا) سے ملنے والی خبر کے مطابق، انسٹی ٹیوٹ آف دی لنگویج آف دی قرآن، ٹورنٹو نے صدر اسلامی مرکز کے انگلش ترجمۂ قرآن کو اپنے دعوہ پیک میں شامل کیا ہے جو کہ کناڈا میں لوگوں کے درمیان بڑے پیمانے پر تقسیم کیا جائے گا۔

13– سی پی ایس امریکا کے ڈاکٹر وقار عالم اور خواجہ کلیم الدین صاحبان نے ایک کتاب "اسلام ناٹ آئی ایس

آئی ایس" نامی کتاب کے اجراء کے ایک پروگرام میں صدر اسلامی مرکز کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی۔ یہ کتاب عورتوں کی ایک آرگنائزیشن وائز (WISE) نے کمیونٹی گائڈ کے طور پر تیار کی ہے۔ یہ پروگرام یو این او (UNO) پلازا میں منعقد ہوا تھا۔ اس پروگرام میں مختلف مذاہب کے 100 سے زائد لوگوں نے، خاص طور پر عیسائی اور یہودی حضرات، نے شرکت کی۔ ان تمام لوگوں کو "ایج آف پیس" بطور تحفہ دی گئی — خوشی کی بات یہ ہے اس تقسیم کے عمل میں دو آرگنائزیشن نے تعاون پیش کیا۔ بہت سے لوگوں نے اس کتاب کو زیادہ تعداد میں حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

14— قارئین الرسالہ حلقہ ناگپور و کامٹی کے ایک ممبر محمد اکرم صاحب نے اپنا ایک واقعہ بتایا جو کہ بہت حوصلہ افزا ہے۔ موصوف نے بتایا کہ حال ہی میں وہ ممبئی سے لوٹ رہے تھے۔ دورانِ سفر وہ صدر اسلامی مرکز کے تحریر کردہ کتابچہ جیون کا ادّیش (ہندی) پڑھنے لگے۔ ایک صاحب بڑی دیر سے انھیں دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد مذکورہ صاحب نے اکرم صاحب سے کتابچہ مانگا اور اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے موبائل پر اس کا فوٹو لینے لگے۔ اکرم صاحب نے کہا آپ یہ کیا کر رہے ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس میں بہت ہی عمدہ باتیں لکھی ہوئی ہیں، میں نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں ایسی باتیں نہیں پڑھیں۔ میں ۱۳ اسکولوں کا مینیجنگ ڈائرکٹر ہوں اور میرے انڈر میں سیکڑوں ٹیچرس ہیں۔ میں اس میں لکھی ہوئی باتیں انھیں بتاؤں گا۔ اکرم صاحب نے انھیں مذکورہ کتاب کے علاوہ ہندی ترجمہ قرآن بھی پیش کیا۔

15— ڈاکٹر اے کیو سوداگر (دھارواڑ، کرناٹک) نے ای ٹی وی اردو پر سی پی ایس سہارن پور کے ذریعہ ترجمہ قرآن اور دوسرے پیس لٹریچر کو تقسیم کرتے ہوئے دیکھا تو اپنے وطن سے سہارن پور آئے تا کہ وہ سی پی ایس کے طریقِ کار کو جان سکیں۔ اس موقع پر ان کو ایج آف اسلام، اسپرٹ آف اسلام اور ترجمۂ قرآن، وغیرہ کرناٹک میں تقسیم کرنے کے لئے دیے گیے۔ انھوں نے ڈاکٹر محمد اسلم کو کرناٹک آنے کی دعوت دی۔ یہ یقینی طور پر دعوت اور امن کے قیام میں کافی معاون ہوگا۔

16— صدر اسلامی مرکز کے مضامین مختلف نیوز پیپرس اور میگزین میں آتے رہتے ہیں۔ جن کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ ذیل میں ایک تاثر نقل کیا جاتا ہے جو دی ٹائمس آف انڈیا کے آن لائن اسپریچول میگزین دی اسپیکنگ ٹری میں ایک صاحب نے لکھا:

It is very good to read Maulana Wahiduddin Khan's articles on the true teachings of Islam in *The Times of India*. (Mr. Mindian)

17— اس کے علاوہ واٹس ایپ (9999944119) سے روزانہ صدر اسلامی مرکز کی مختصر تقریر، انگریزی تفسیر اور مضامین بھیجے جاتے ہیں۔ اس پر ایک صاحب نے اپنا تاثر نقل کیا ہے: جب سے میں آپ سے جڑا ہوں، میری طرز زندگی تبدیل ہونے لگی ہے۔ شکریہ (جاوید اقبال)

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔ الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

1۔ الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن 33 فی صد ہے۔ 50 پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن 40 فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ 2۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ 3۔ کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تین مہینے تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرتعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے (ہوائی ڈاک)
ایک سال	Rs. 200	$20
دو سال	Rs. 400	$40
تین سال	Rs. 600	$60

ہر اتوار 10.30 AM کو صدر اسلامی مرکز کی تقریر کو لائیو دیکھنے کے لیے ان لنکس پر کلک کریں:

http//:www.ustream.tv/channel/cps-international **(For High Speed)**
http//:m.ustream.tv/channel/cps-intl-slow **(For Slow Speed)**

مزید اردو اور انگلش ویڈیو، آڈیو دیکھنے، سننے اور ڈاؤن لوڈ کرنے کے لیے ان پیجز پر جائیں:

http//:www.cpsglobal.org/videos
http//:www.cpsglobal.org/podcasts

Date of Posting 10th and 11th of advance month Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2015-17
Published on the 1st of every month RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2015-17